دسمبر 2005

قیمت: -/10 روپے

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

امرتا پریتم

ولادت: 31 اگست 1919 وفات: 31 اکتوبر 2005

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
شعبۂ اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

قومی اردو کونسل کے ایگزیکٹیو بورڈ کی میٹنگ 20 اکتوبر 2005 کو کونسل کے کمیٹی روم میں منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں (بائیں سے) جناب شمس الرحمن فاروقی (وائس چیئرمین قومی اردو کونسل)، محترمہ نیلم رانی، جناب ایس. موہن (ڈائرکٹر انچارج قومی اردو کونسل)، ڈاکٹر آر. کے. بھٹ (پرنسپل پبلی کیشن آفیسر قومی اردو کونسل) اور پروفیسر قمر رئیس۔

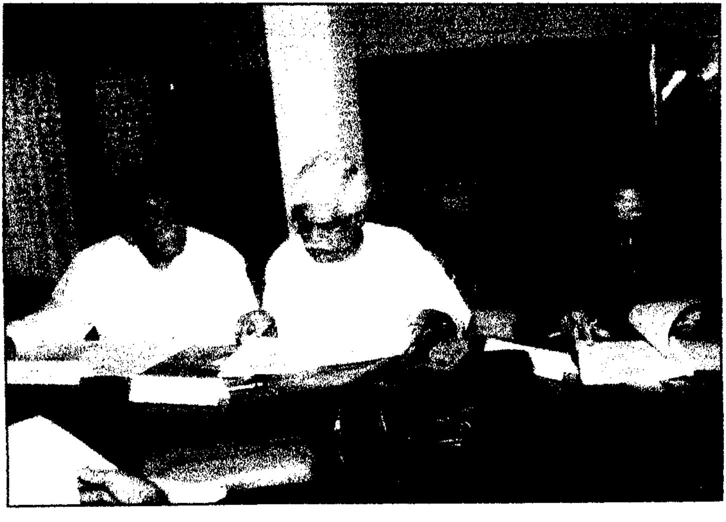

اسی موقعے کی ایک اور تصویر میں (دائیں سے) پروفیسر اے. ایم. پٹھان (وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)، ڈاکٹر علی جاوید اور جناب اقبال مجید۔

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔7، شمارہ۔12 دسمبر 2005

مدیر: ایس. موہن

معاون مدیر: ڈاکٹر فیروز عالم

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل محکمہ ثانوی واعلی تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہباز اختر، قومی اردو کونسل

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔ 88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز -II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی - 110 066
فون: 26103938 26103381
26179657 فیکس: 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746

شاخ: 110-7-22 قمر ذطور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات ..... خطوط 2
ہماری بات ..... اداریہ 4
● ہندوستان میں اردو صحافت (گیسٹ کالم) ..... جی. ڈی. چندن 5
● حبیب تنویر سے گفتگو ..... راجیش کیسرا 13
● کارل یونگ ---- ..... سید اقبال امروہوی 15
● نوبل انعامات 2005 ..... سید امتیاز الدین 24
● خلائی تحقیقات ایک جائزہ ..... انور ادیب 26
● کیا گدھ محفوظ رہ سکیں گے؟ ..... محمد خلیل 28

اتہاس کے جھروکے سے:

● پانی پت کی تیسری جنگ ..... مدن گوپال 31

گوشۂ ادب:

● الوداع امرتا پریتم ..... امروز 34
● روشنی گویا شفاف اندھیرے میں نہائی ہوئی ..... کنور نارائن 36

ہماری مطبوعات

● مرزا دبیر کی اردو نثر نگاری
("مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے" سے اقتباس) ..... مرزا محمد زماں آزردہ 38
● ابتدائی مدارس میں رہنمائی
("تعلیمی رہنمائی اور صلاح کاری" سے اقتباس) ..... عبدالغنی مدہوش 43

طلبہ کے لیے

● فوڈ ٹیکنالوجی میں کیریز ..... تنویر عالم 48
● ارتھمیٹک آپریٹرز اسٹینڈرڈ ان پٹ آؤٹ پٹ ..... پنیت گیر، استوتی تریکھان 51
● اردو زبان و ادب (کوئز) ..... محمد فیروز 57
● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-29) ..... روبینہ ناز 60
اُردو خبرنامہ ..... ادارہ 61
تبصرہ و تعارف ..... کتابوں پر تبصرے 68
● اتحاد سے انتشار کی طرف — کلونیل اودھ کے قصبات/ مشیر الحسن ..... مبصر: مخمور سعیدی
● ناٹک ساگر/ نورالٰہی و محمد عمر ..... مبصر: فیاض عالم
● تعلیمی رہنمائی اور صلاح کاری/ عبدالغنی مدہوش ..... مبصر: رئیس احمد
● پوکے مان کی دنیا/ مشرف عالم ذوقی ..... مبصر: فیروز عالم
● آل احمد سرور کے تبصرے/ محمد ضیاء الدین انصاری ..... مبصر: شہاب ظفر اعظمی

بچوں کا گوشہ

● ایشور چندر ودیا ساگر ["ہمارے رہنما" (جلد نہم) سے اقتباس] ..... دیپاولی دیب رائے 74

آپ کی بات

ڈاکٹر م.ق. سلیم، سائبان، 19-2-469، فتح دروازہ، حیدرآباد

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ نومبر 2005 زیرِ نظر ہے۔ یہ اردو والوں کا المیہ ہے کہ وہ اچھے ادب کو فراموش کر رہے ہیں۔ کتاب کی دکانوں پر جو رسالے نظر آتے ہیں وہ دوسرے بلکہ تیسرے درجے سے بھی کم معیار کے ہیں۔ کتب فروشوں کا کہنا ہے کہ اردو کے معیاری ادبی رسائل کو کوئی خریدنے والا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد اردو کا گہوارہ ہوتے ہوئے بھی اردو کے معیاری رسالوں سے دور ہے۔ ایک محدود حلقہ جو خود تو رسالے نہیں منگواتا اپنے کتب خانے، یونیورسٹی کے شعبوں اور دوسرے ذرائع سے منگوا کر عوام کی ملکیت کو اپنی ملکیت بنا لیتا ہے۔ ''انڈیا ٹوڈے'' نے تجرباتی طور پر اردو میں رسالہ نکالا، مگر اردو داں طبقے نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اس طرح کے کئی ادبی رسالے ہیں جو شاندار طریقے سے سامنے آتے ہیں اور پھر دوسرے یا تیسرے شمارے کے بعد غائب ہو جاتے ہیں۔ اس پر آشوب دور میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ''اردو دنیا'' کے ذریعے جو خدمت انجام دے رہی ہے وہ قابل صد آفریں ہے۔ کم قیمت میں اردو والوں کو معیاری رسالہ مل گیا (یہ رسالہ بھی ہمارے یہاں بک اسٹالوں پر کم ہی دستیاب ہے)۔ نومبر کا شمارہ کافی معلوماتی ہے۔ سید حامد صاحب سے گفتگو نے لطف دوبالا کر دیا۔ انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی یہ رائے کہ اردو میڈیم اسکولوں میں سینڈوچ کورس اور summer کورس چلائے جائیں، بہت اہم ہے۔ مسلمانوں کے ایک ٹی وی چینل کا مشورہ بھی قابل توجہ ہے۔ روزنامہ ''منصف'' اردو چینل شروع کرنے کے بارے میں غور کر رہا ہے۔ ویسے ای ٹی وی اردو چل رہا ہے لیکن اس سے مسلمانوں کی نمائندگی نہیں ہوتی۔ کسی وقت مسلمانوں کے لیے انگریزی اخبار کی بات بھی ہوتی تھی اور غالباً سید حامد صاحب بھی اس تحریک میں شامل تھے مگر اس کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ یہ کام سید حامد صاحب کی سرپرستی میں ہو سکتا ہے۔ ''اردو دنیا'' نئی نسل کے لیے کمپیوٹر، ثقافت اور تاریخ کا جو مواد پیش کر رہا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ ''ای ٹیوشن'' مضمون اچھا ہے۔ مولانا آزاد کی تاریخ پیدائش 9 نومبر بتائی گئی ہے جبکہ بعض اخبارات میں 11 نومبر بتائی گئی ہے۔ 9 نومبر علامہ اقبال کی پیدائش کا دن ہے۔ مولوی عبدالحق کے یوم پیدائش کو یوم اردو کے طور پر منانا چاہیے اور مولانا آزاد کے یوم پیدائش کو یوم اساتذہ کی طرح ''یوم تعلیم'' منایا جائے اور تعلیمی میدان میں کارہائے نمایاں کام کرنے والوں کو اعزازات و انعامات سے نوازا جائے۔

- **اعجاز اختر (اعجاز عبید) 9-1-25/A/1، ہاشم نگر، لنگر ہاؤس، حیدرآباد**

ستمبر 2005 کے ''اردو دنیا'' میں میرا مضمون ''کمپیوٹر اور اردو'' عنوان کی تبدیلی کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ شاید اس مضمون کا فارمیٹ تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس کی وجہ سے کچھ غلطیاں پیدا ہو گئی ہیں، جن کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں۔ صفحہ 10 پر پہلے کالم کی 27 ویں سطر میں 95 (95) ۵، ہو گیا ہے۔ 'A' کا آسکی نمبر 90 ہے۔

صفحہ 11 کے دوسرے کالم میں عدد ۶ (6) نقطے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ دوسرے پیراگراف کی ساتویں سطر میں 16 بٹ نظام .1 بٹ نظام، اگلی سطر میں دو پر 10 کی طاقت تھی۔ 532. چھپا ہے، یہ دو پر 16 کی طاقت یعنی 65536، ہونا چاہیے۔ ایک غلطی اپنی بھی قبول کر لوں۔ صفحہ 10 کے پہلے کالم، 11 ویں سطر میں اعداد (صفر سے نو) ہونا چاہیے۔ میں نے محض ایک سے نو لکھ دیا تھا۔

میرے مضمون لکھنے کے بعد ایک اور اہم ویب سائٹ کی تشکیل ہوئی ہے جو مکمل اردو تحریر میں ہے، اسے www urdu web.org پر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ اطلاع بھی قارئین کے لیے دلچسپ ہوگی کہ اردو کی ویب سائٹس کے لیے مخصوص سرچ انجن ''یوہو'' بھی urdustan.com پر دستیاب ہے۔ جناب مولا بخش کے مضمون اردو زبان اور نئی نسل میں اردو کی جن ویب سائٹس کا نام دیا گیا ہے وہ زیادہ تر تصویری شکل میں ہیں اردو تحریر (یونی کوڈ) میں نہیں۔

- **محمد ہاشم قدوائی، سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی**

''اردو دنیا'' کا نومبر کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد پر پروفیسر رشید الدین خاں کی گراں قدر تصنیف ''ابوالکلام آزاد ہمہ گیر شخصیت'' اقتباس بہت پسند آیا۔ مصنف نے مولانا مرحوم کی عبقری اور نابغۂ روزگار شخصیت کے گوناگوں امتیازی پہلوؤں کو بڑی ہی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ آپ لائق صد مبارکباد ہیں کہ اس شمارے میں آپ نے ہندوستان اور پاکستان کے جلیل القدر اور عظیم المرتبت ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی کا ایک ادبی شاہکار شامل کیا۔

امید ہے کہ آئندہ بھی ایسے ادبی شاہ کاروں اور جواہر پاروں کو "اردو دنیا" کے اوراق میں پیش کیا جائے گا۔

مدن گوپال صاحب کا مضمون "وراثت کی جنگ" اور حبیب الرحمن چغانی کا مضمون "قومی مشن برائے مخطوطات" بھی بہت پسند آئے۔

- **شاداں سلطان پوری، معرفت مسیح پبلی کیشنز، بھٹی جرولی،**
  پوسٹ کثاواں، ضلع سلطانپور (یوپی)

ماہنامہ "اردو دنیا" نومبر 2005 موصول ہوا۔ رسالہ صوری اور معنوی ہر دو اعتبار سے بہت خوب ہے۔ کتابوں پر تبصرے بھی عمدہ ہیں لیکن منوہر راج سکسینہ، حبیب الرحمن چغانی، مدن گوپال، عبدالماجد دریابادی، مشیرالحق اور رشیدالدین وغیرہ کی تخلیقات سے "اردو دنیا" کی افادیت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ معائب سخن اور شعرائے اردو کی اصلاحیں کے تحت تخلیقات بھی شائع کریں۔ یہ نئی نسل کی ادبی اور ذہنی تربیت کے لیے از حد ضروری ہے ورنہ مستقبل میں زبان اردو، کسی نہ کسی شکل میں زندہ تو رہے گی لیکن اچھے ادب کے نمونے ملنے کے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ موجودہ نسل پڑھنے لکھنے کی بجائے جی حضوری، جوڑ توڑ، منافقت اور مفاد پرستی ہی کو اپنا نصب العین تصور کرتی ہے۔

- **ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، بلاک رسورس سنٹر، نگی خانہ، پرانا پاور ہاؤس، ٹونک**

ستمبر 2005 کے شمارے میں "اردو زبان اور نئی نسل" از مولا بخش اسیر معلوماتی مضمون ہے۔ دوسرا اہم مضمون محمد ظفرالدین کا ہے جس میں نصاب کے حوالے سے ترجمہ اور ابلاغ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اگر یونیورسٹیاں ترجمہ پر خصوصی توجہ فرمائیں تو واقعی بیروزگاری کا شکوہ کچھ کم ہو سکتا ہے۔

"اردو دنیا" ایک بے حد معلوماتی اور معیاری رسالہ ہے۔ عبدالرزاق صاحب نے کونسل کی کارکردگیوں کا مبسوط جائزہ پیش کیا ہے۔

- **ملکہ فردوس، متعلم اے. ایس. پبلک اسکول،**
  مولانا آزاد کالونی، رانچی-1 جھارکھنڈ

میں "اردو دنیا" بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ میرے گھر میں یہ رسالہ جب سے شائع ہو رہا ہے اسی وقت سے آ رہا ہے۔ ہم لوگوں نے اس کی ایک فائل بنائی ہے۔ اکتوبر 2005 کے شمارے میں کئی مضامین بے حد اچھے لگے۔ مثلاً "اردو کا نیا مرکز جنوبی ہند"، "اردو صحافت کے مسائل"، "مہاتما گاندھی اور سیکولر ریاست"، "صنعت و حرفت"، "بخار" وغیرہ۔ ان مضامین کے مطالعے سے مجھے بے حد جانکاری ملی۔ جناب مخمور سعیدی کی نظم لاجواب ہے۔ اس کو میں نے کئی بار پڑھا۔ صفدر امام قادری کا مضمون "سول سروس امتحان کے لیے اردو زبان و ادب کی تیاری" بے حد کارآمد مضمون ہے۔ بچوں کے گوشے میں اجگر پر مضمون بھی اچھا ہے۔

- **محمد ہاشم عادل، پہلی منزل، 2A، نور علی لین، پوسٹ انٹالی، کلکتہ**
  -14 (مغربی بنگال)

محمد محمود فیض آبادی کا مضمون بعنوان "مہاتما گاندھی اور سیکولر ریاست" نہایت ہی مربوط، جامع اور ہم ہندوستانیوں کے لیے شاہراہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ افسوس کہ ہمارے ہم وطنوں نے گاندھی جی کے خیالات اور آدرشوں کو فراموش کر دیا ہے۔ محمود فیض آبادی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے دستور ہند کے حوالے سے لفظ سیکولر اور سیکولر ریاست کی وضاحت بڑے واضح انداز کی ہے۔

- **شیخ مناف احمد، نارتھ مہاراشٹر یونیورسٹی،**
  پوسٹ بکس-80، جلگاؤں (مہاراشٹر)

میں پچھلے کئی برسوں سے "اردو دنیا" کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس کے مضامین بہت ہی دلچسپ ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتا ہے۔ آپ کی کوششیں واقعی قابل تحسین ہیں۔

- **ایم. اے. قدوائی، الیف-3146، راجاجی پورم، لکھنؤ-226017**

آپ کا موقر ماہنامہ "اردو دنیا" نظر سے گزرا۔ واقعی اس میں پوری اردو دنیا موجود ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا یہ کارنامہ قابل ستائش ہے۔ اس میں ہر شعبۂ حیات سے متعلق مضامین موجود ہیں۔

- **عارف علی، بایوٹیکنالوجی پروگرام، شعبۂ بایو سائنسز،**
  فیکلٹی آف نیچرل سائنسز، مولانا محمد علی جوہر مارگ، نئی دہلی-110025

جامع اردو انسائیکلوپیڈیا جلد -6، سائنسی علوم (حیاتیات، زراعت، نباتیات) موصول ہوا۔ اس کا گیٹ اپ اور طباعت، بہت عمدہ اور نفیس ہے۔ اس طرح کے کام کی ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی اور کسی حد تک یہ کتاب اس خلا کو پر کر سکے گی۔ مجھے خوشی اس بات کی بھی ہے کہ اس کام سے میں بھی منسلک رہا اور خاص طور سے میں ڈاکٹر محمد ارشد اقبال کا مشکور ہوں کہ انھوں نے مجھ سے یہ کام کروالیا۔ ان کی خود کی کاوش بہت زیادہ رہی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ حیاتیات کے ہر موضوع پر اسی طرح کی کتاب شائع کی جائے۔

□□□

ہماری بات

گذشتہ دنوں جن دو اہم ادبی شخصیات نے جہان ادب کو خیرباد کہا ان میں ایک ممتاز پنجابی شاعرہ اور ادیبہ امرتا پریتم اور دوسرے نامور ہندی ناول نگار اور افسانہ نگار نرمل ورما ہیں۔ ان دونوں کو ہندوستان کے سب سے بڑے ادبی اعزاز گیان پیٹھ سے بھی نوازا گیا تھا۔ امرتا پریتم بھلے ہی پنجابی زبان میں لکھتی تھیں لیکن دیگر ہندوستانی زبانوں کے قارئین بھی ان کی کتابوں کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں، پنجابی کے سینئر ادیب سرجیت پاتر نے ان کے انتقال کی خبر سن کر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کا جانا ایسا ہی ہے جیسے پنجاب کی پانچوں ندیاں نہیں رہیں۔ وہ ایک ایسا چاند تھیں جسے کبھی مانگے کی روشنی کی ضرورت نہیں پڑی بلکہ دوسرے ان کی روشنی سے فیض یاب ہوئے۔ امرتا پریتم کی نظموں میں ایک ایسی عورت ہے جو اپنے تشخص کی تلاش کر رہی ہے اور عشق اس تلاش کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ عشق دراصل خود کو پہچاننے کے مترادف ہے لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ عورت کے لیے ہر قدم پر پابندیاں ہیں۔ امرتا پریتم ہمیشہ ان پابندیوں کی مخالفت کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں جس محبت کی تڑپ ہے وہ محض جسمانی نہیں ہے اس میں روحانیت ہے اور یہ روحانیت دراصل تصوف سے ان کے گہرے لگاؤ کی بدولت ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان کی تخلیقات کا دائرہ محض روحانیت یا عشق حقیقی اور عشق مجازی تک ہی محدود ہے بلکہ سماجی حقائق کی عکاسی بھی ان کی تخلیقات میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی کہانیوں اور نظموں میں عوام کا درد و غم موجود ہے۔ خاص طور پر تقسیم ملک کے سانحے کی تصویر کشی انھوں نے بڑے دلسوز انداز میں کی ہے۔ ’’پنجر‘‘ اس کی بہترین مثال ہے۔ اس میں تقسیم کے بعد کی تباہی و بربادی خصوصاً عورتوں پر ہونے والے مظالم کی خونی داستان ہے۔ ان کا سوانحی ناول ’’رسیدی ٹکٹ‘‘ ہندوستانی ادب میں نمایاں مقام کا حامل ہے۔ اس میں انھوں نے نہایت بیباکانہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مشہور صحافی اور انگریزی ادیب خشونت سنگھ کو جب امرتا پریتم نے بتایا کہ وہ اپنی خودنوشت لکھنے کا منصوبہ بنا رہی ہیں تو انھوں نے کہا تھا کہ آپ کی زندگی میں ایک یا دو واقعات کے علاوہ ہے ہی کیا۔ اپنی خودنوشت تو آپ رسیدی ٹکٹ کی پشت پر لکھ سکتی ہیں۔ لیکن امرتا پریتم اس جواب سے بددل نہ ہوئیں اور ’’رسیدی ٹکٹ‘‘ (1976) کے عنوان سے ہی ایک ایسا شاہکار تخلیق کیا جس کی ستائش خود خشونت سنگھ نے بھی کی۔

امرتا پریتم کے 24 ناول، 15 افسانوی مجموعے اور 23 شعری مجموعے اب تک منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازی جانے والی وہ پہلی خاتون تھیں جو انھیں 1955 میں شعری مجموعے ’’سنہرے‘‘ کے لیے دیا گیا وہ پہلی پنجابی خاتون تھیں جنھیں 1969 میں پدم شری سے نوازا گیا اور 1982 میں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بعد ازاں 2004 میں انھیں پدم وبھوشن سے بھی نوازا گیا۔

امرتا پریتم کی پیدائش 31 اگست 1919 کو گجرانوالہ (پاکستان) میں ہوئی۔ ان کے والد ایک اسکول میں مدرس تھے اور شاعری کا شغف رکھتے تھے۔ جب وہ گیارہ سال کی تھیں تو ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح ان کا بچپن پریشانیوں میں گزرا۔ لیکن اسی عمر میں ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ 16 سال کی عمر میں شائع ہوا۔ امرتا کی شادی ایک صحافی پریتم سے ہوئی تھی جن سے وہ کبھی ہم آہنگ نہ ہوسکیں اور آخرکار 1960 میں دونوں نے علیحدگی اختیار کرلی اور ان سے سات سال چھوٹے ’’امروز‘‘ نے زندگی بھر ایک سچے اور وفادار ساتھی کی حیثیت سے ان کا ساتھ دیا۔

اپنی 86 سالہ زندگی میں امرتا پریتم نے تقریبا 80 کتابیں لکھیں۔ تقسیم ملک ان کے لیے ایک بڑا سانحہ تھا جس نے ان سے اپنا وطن اور عزیز و اقارب چھین لیے۔ ان تمام صدمات کے باوجود ان کی شاعری اور افکار و نظریات خیر سگالی کے جذبے سے معمور تھے اور ان کی آواز عوام الناس کی آواز اور پکار ہوتی تھی۔

ہندی میں نئی کہانی کا آغاز کرنے والے نرمل ورما کی شخصیت بھی نام کی طرح ہی نرمل تھی۔ ان کی پیدائش 3 اپریل 1929 کو شملہ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے دہلی یونیورسٹی کے سینٹ اسٹیفن کالج سے تاریخ میں ایم اے کرنے کے بعد کچھ عرصے تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1959 میں ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ’’پرندے‘‘ شائع ہوا۔ ’’وہ دن‘‘، ’’لال ٹین کی چھت‘‘، ’’ایک چتھڑا سکھ‘‘، ’’رات کا رپورٹر‘‘ اور ’’انتم ارنیہ‘‘ کے نام سے انھوں نے پانچ ناول لکھے۔ ’’پرندے‘‘، ’’کوے اور کالا پانی‘‘، ’’جلتی جھاڑی‘‘، ’’پچھلی گرمیوں میں‘‘، ’’بیچ بحث میں‘‘، ’’میری پریہ کہانیاں‘‘، ’’پرتیندھی کہانیاں‘‘ اور ’’سوکھا اور انیہ کہانیاں‘‘ ان کی کہانیوں کے اہم مجموعے ہیں۔ ان کے مضامین کے چھ مجموعے اور تین سفرنامے شائع ہوئے۔ انھوں نے عالمی ادب کے کئی شاہکاروں کا ہندی میں ترجمہ بھی کیا۔ 1985 میں ’’کوے اور کالا پانی‘‘ پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا اور 1999 میں ان کی مجموعی خدمات کے لیے گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

نرمل ورما نے کافی عرصہ غیر ممالک میں گزارا۔ اس دوران انھوں نے نہ صرف مغربی تہذیب کی اقدار کو سمجھا بلکہ مشرق کو مزید بہتر انداز سے جاننے کی سنجیدہ کوشش بھی کی۔ ان کی مختلف کہانیوں، سفرناموں اور رپورتاژ میں مشرق اور مغرب کے امتیازات کو دیکھا جاسکتا ہے۔ نرمل ورما ایک ایسے ادیب کے طور پر یاد کیے جائیں گے جنھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے نہ صرف ہماری اقدار کی عکاسی کی بلکہ حقوق انسانی کی حمایت کے ساتھ ساتھ دیگر عالمی مسائل کو بھی انھوں نے بیباکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے آخری ناول ’’انتم ارنیہ‘‘ کے بارے میں ایک ناقد نے لکھا تھا کہ وہ موت کے اسرار سے پردہ اٹھاتا ہے اور زندگی میں دکھ برداشت کرنے کا ہنر سکھاتا ہے۔ موت اور زندگی کے اسرار سے پردہ اٹھانے والا یہ ادیب بھلے ہی ہم سے رخصت ہوگیا لیکن اپنی تحریروں کی بدولت وہ ہمیشہ ہمارے پاس موجود رہیں گے۔

بلاشبہ ان دونوں عظیم قلم کاروں کی کمی ہندوستانی ادب کی تاریخ میں ہمیشہ کھٹکتی رہے گی۔

تحریر: جی. ڈی. چندن
ترجمہ: مشرف علی

گیسٹ کالم

ہندوستان میں اردو صحافت

آزادی کے وقت اردو صحافت 125 سال پرانی تھی اور یہ انڈین نیشنل کانگریس سے 63 سال قبل وجود میں آچکی تھی۔ 125 سال کا یہ عرصہ شاندار کارناموں، بے غرض قربانیوں اور مخلصانہ عمل کا دور تھا۔ بلاشبہ یہ اہم طویل دور تھا جسے عموماً نظر انداز کردیا جاتا ہے۔

چھاپہ خانے کی آمد سے بہت پہلے ہی اس صنف کا نامہ نگار پورے ہندوستان میں سرگرم عمل تھا۔ یہ صنف کتابت شدہ فارسی صحافت کی براہ راست وارث تھی جس کا تسلط مغلیہ عہد کے آغاز سے لے کر انقلاب 1857 تک قائم تھا۔ مغل حکمرانوں کے دور میں ریاستی خفیہ خبر رسانی کا نظام پورے ملک میں موجود تھا اور اس کام کو پیشہ ور نامہ نگار انجام دیتے تھے جنھیں وقائع نگار کہا جاتا تھا۔ ان کے ذریعے بھیجی گئی خبروں کو جو حکمرانوں کے لیے ہوتی تھیں، 'اخبار' کہا جاتا تھا۔ یہ فارسی اصطلاح ہے جو اخباری مراسلے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یہ اخبار سلطنت کے مختلف حصوں کے سیاسی، معاشی اور سماجی صورت حال کی اندرونی خبریں فراہم کرتے تھے۔ چھاپہ خانے کے وجود میں آنے سے قبل اس نظام نے موثر کردار ادا کیا۔

اٹھارھویں صدی کے آغاز میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد بہت سارے وقائع نگار جو اب بے روزگار ہو چکے تھے، انھوں نے خبر نامہ نکالنا شروع کیا جسے 'اخبار' کہا گیا۔ ان کا محبوب موضوع برطانوی تسلط کا خاتمہ تھا۔ اس دور کے ایک برطانوی عیسائی پادری (Clergyman) ریو جے لونگ (Rev. J. Long) نے کہا تھا کہ ان اخباروں میں یوں تو کوئی خاص بات نہیں تھی تاہم ان میں جذباتی اور عشقیہ گیتوں کی طرح ایسی تاثیر تھی جس نے ایک ملک کی سمت متعین کی۔ 1836 میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ نے ان اخباروں کو ''اخلاقی ضابطوں سے محروم'' شرانگیز اور لوگوں کے ذہنوں کو مشتعل کرنے والا بتایا۔'' (ایس سی سانیال، کلکتہ ریویو، 1911 ص 15-14، بحوالہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: ''نیوز لیٹرز ان دی اور ینٹ۔'' ص-86)۔

ان کتابت شدہ خبر ناموں نے برطانوی حکومت کے خلاف 1857 کے عوامی انقلاب کے لیے زمین تیار کی کیونکہ ان کے مضامین کو عوامی مقامات پر نامہ نگاروں کے ذریعے جو خود ہی ان اخباروں کے مدیر اور ناشر بھی تھے، باآواز بلند پڑھا جاتا تھا۔ ان نامہ نگاروں کا جو نہ صرف مبلغ تھے بلکہ آزادی کا گیت بھی گانے والے تھے، لوگ بے صبری سے انتظار کرتے تھے۔

یہ خبر نامے اردو زبان میں پہلی مرتبہ شائع ہونے والے اخباروں کا نقطۂ آغاز تھے جس کا آغاز 1822 میں مشرق میں کلکتہ سے ''جام جہاں نما'' سے ہوا۔ یہ ہفت روزہ اخبار انتظامیہ کی نکتہ چینی کرنے والا تھا جسے ہری ہردت نے شروع کیا تھا۔ ہری ہردت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم اور مشہور مصلح اور معمار قوم راجا رام موہن رائے کے صحافتی معاون تارا چند دت کے بیٹے تھے۔ اردو پریس مشرق سے شمال کی طرف 1837 میں آیا۔ شمالی ہند کے پہلے اردو اخبار ''دہلی اردو اخبار'' کے مدیر مولوی محمد باقر کو انگریزوں نے 1857 میں حکومت کے خلاف تحریری جہاد کی پاداش میں گولی مار کر شہید کردیا۔ انھوں نے نہایت خاموشی سے ایسی روایت شروع کی جو کہ آزادی کی حصولیابی (اگست 1947) تک برقرار رہی۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے اخباروں نے بھی اپنے اپنے علاقوں میں تحریک آزادی کی جنگ میں بھرپور تعاون کیا۔ لیکن انھیں وہ صدمہ برداشت نہیں کرنا پڑا جس سے اردو زبان دوچار ہوئی۔ بیسویں صدی کے ربع دوم میں دوقومی نظریے کی سیاست کی وجہ سے اردو کو یہ صدمہ برداشت کرنا پڑا کیونکہ دوقومی نظریے کے سرگرم حامیوں نے اپنے مطالبے کے جواز کے لیے جو 14 نکات پیش کیے، اس میں اردو زبان بھی شامل تھی۔ یہ سیاست جو کہ برطانوی پالیسی ''پھوٹ ڈالو اور راج کرو'' کے تحت پروان چڑھی، بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت کا باعث بنی۔ بڑے پیمانے پر ہجرت کے اس عمل نے نہ صرف لاکھوں لوگوں کو گہرا صدمہ پہنچایا اور انھیں گھر سے بے گھر کردیا بلکہ صدیوں پرانی ہندوستانی تہذیب کو بھی پامال کیا خاص طور پر اردو زبان کو جو کہ ہندوستانی تہذیب کا ایک اہم اور ناگزیر حصہ ہے۔

برطانوی حکومت کی آمد سے قبل یہ زبان مسلم حکمرانوں کے دور میں پروان چڑھی اور ان حکمرانوں نے ہندوستان کو مادر وطن سمجھا جب کہ اس کے برعکس انگریزوں کا واحد مقصد قدرتی وسائل سے مالا مال اس ملک کو لوٹنا،

استحصال کرتا اور یہاں اپنی نوآبادی قائم کرتا تھا۔ اس زبان میں غیر معمولی تخلیقی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے اور آندھرا پردیش کے ایک مشہور و معروف ماہر قانون کے مطابق ہندو، مسلم اور اس خطۂ ارض پر رہنے والے دیگر باشندوں کے باہمی تعاون اور ان کے درمیان ہونے والی مشاورتوں اور باہمی اختلاط کے بعد اس میں مزید ترقی ہوئی۔ (منوہر راج سکسینہ: ''اور کمپوزٹ کلچر اینڈ اردو'' روز نامہ سیاست، حیدرآباد، وژن سپلی مینٹ، 24.1.2004)۔ اس طرح ہندوستان اردو زبان کے بانیوں کا حقیقی وطن ہے اور یہیں ان کی وراثت بھی موجود ہے۔

1857 کے تاریخی انقلاب کو اس زبان سے تحریک حاصل ہوئی اور یہ زبان بشمول فارسی کے جو اس دور میں درباری زبان تھی، نہایت زرخیز، بے باک اور مقبول عام ترسیل کا ذریعہ تھی۔ اردو نے ''انقلاب زندہ باد'' کا پرجوش انقلابی نعرہ دیا جس نے ناقابل شکست برطانوی حکومت کی جڑیں ہلا دیں اور اس نے بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو جیسے ممتاز مجاہدین آزادی پیدا کیے جو یہ نعرہ لگاتے ہوئے آزادیٔ وطن کی خاطر سولی پر چڑھ گئے۔

یہ زبان اور اس کی صحافت اس دور میں عوام کو آگے بڑھانے کا ایک بہترین ذریعہ تھی اور یہ تقسیم ملک سے قبل مختلف طبقوں کی محبوب زبان تھی۔ اس ملک کی تقریباً ہر سیاسی جماعت کے پاس اردو کا ایک جریدہ تھا۔ یہاں تک کہ مہاتما گاندھی کے مشہور اخبار ''ہریجن'' کا بھی اردو ایڈیشن نکلتا تھا۔ لیکن دوقومی نظریے کی سیاست کے باعث ہونے والی مذہبی بحث نے 1940 کے عشرے کے دوران ہندوستان کے دو اہم طبقوں کے درمیان خلیج پیدا کردی اور ان دو طبقوں کے اردو اخبارات نے مختلف مواقع پر ان کے درمیان بڑھتی ہوئی عداوت کے لیے میدانِ جنگ کا کام کیا۔ برطانوی حکومت جس کا ہندوستان میں خاتمہ ہو رہا تھا، اپنے مخصوص انداز میں اس تمام صورت حال سے چشم پوشی کر رہی تھی۔

آزادی کے بعد یہ غلط فہمی مزید بڑھ گئی۔ نئی حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے والے سیاست دانوں کے ایک گروہ کے ذریعے اردو پریس کے بعض افراد کے سرگرم کردار کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا۔ انھوں نے دانستہ طور پر دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہجرت کرنے والوں کے ہم مذہب افراد کے خلاف معاملات کا رخ موڑ دیا۔ جب کہ دوسری زبانوں کے کچھ اخبارات نے بھی بغیر سوچے سمجھے، دو قومی نظریے کی سیاست پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ تقسیم ملک کے وقت اردو صحافت کے تعلق سے دوسری زبانوں کے اخبارات کا جو ردعمل تھا، اس کے صحیح تجزیے کا ہنوز انتظار ہے۔ ان سیاست دانوں کے طرزِ عمل کے سبب بدنصیب اردو زبان کو نقصان پہنچا اور اردو صحافت کے مستقبل پر بھی اس کا اثر پڑا۔

نتیجتاً آزادی کے وقت اس عظیم ملک میں بدگمانی اور عدم اعتمادی کی وجہ سے خون کی ندیاں بہیں۔ پنجاب، دہلی، اتر پردیش، بنگال اور حیدرآباد میں اس تقسیم کا شدید اثر ہوا اور یہ جملہ ریاستیں دوقومی نظریے کے تئیں بہت زیادہ ذمے دار تھیں۔

جنگ آزادی کے دوران تمام طبقے کے افراد اردو مدیروں کو ان کے مذاہب اور نظریے سے قطع نظر، زبان پر ان کی گرفت اور اسلوب کی وجہ سے وسیع پیمانے پر پڑھتے تھے۔ ایسے لوگ جو خود اردو اخباروں کا مطالعہ نہیں کرسکتے تھے، وہ دوسروں سے ان اخباروں کے مضامین کو سنتے تھے۔

راقم الحروف اس بات کا شاہد ہے کہ مختلف قسم کے لوگوں کی بھیڑ شام کے وقت اکثر کسی مشہور بازار کے کسی خاص گوشے میں جمع ہوتی تھی جہاں اردو جاننے والا ایک فرد ان کے پسندیدہ اردو اخبار سے اداریے کا کچھ حصہ یا کوئی نظم پڑھتا تھا جسے لوگ نہایت جوش اور ولولے کے ساتھ سنتے تھے۔

سابقہ برطانوی حکومت کے پاس ایسا کوئی نظام نہیں تھا جس سے کہ ملک کی مختلف زبانوں میں نکلنے والے اخباروں اور جریدوں اور ان کی اشاعت کو شمار کیا جاسکے۔

ہندوستان کی نئی حکومت کے ذریعے پہلا پریس کمیشن (1952-55) قائم کیا گیا۔ اس کمیشن کو شروع میں اپنا کام ناممکن لگا کیونکہ اس کے پاس قومی پریس سے متعلق پہلے سے کوئی قابل اعتماد اعداد و شمار موجود نہیں تھے۔ اس کمیشن نے فوری طور پر رجسٹرار آف نیوز پیپرس آف انڈیا (RNI) کے خصوصی دفتر کے قیام کی سفارش کی تاکہ یہ دفتر ہندوستان میں صحافت کے اعداد و شمار سے متعلق قابل اعتماد رپورٹ ہر سال اپریل کے آخر میں وزارت برائے اطلاعات و نشریات (Ministry of Information and Broad casting) کو پیش کرے۔

اس آفس کی پہلی سالانہ رپورٹ 1958 میں شائع ہوئی جس میں 1957 کے ہندوستانی صحافت سے متعلق تفصیلی اعداد و شمار کو پیش کیا گیا۔

19 اکتوبر 1961 کو نئی دہلی میں اردو اخبارات اور کتابوں کی کل ہند نمائش کے افتتاح کے موقعے پر وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تقریر میں اس بات کا انکشاف کیا کہ متحدہ ہندوستان میں اردو اخبارات اور جریدوں کی کل تعداد 415 تھی اور یہ تعداد تقسیم وطن کے بعد 345 رہ گئی یعنی 70 اخبارات نئے ملک پاکستان میں رہ گئے۔ تقسیم وطن کی سیاست کی وجہ سے

شدید فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوئے اور ان فسادات کے سبب سرحد کے دونوں طرف بڑے پیمانے پر لوگوں کو ہجرت کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ ہندوستان ہجرت کرنے والے تمام اخبارات اور جریدوں کے مالک ہندو تھے۔ یہ بات عام طور پر لوگ نہیں جانتے ہیں کہ اس کارواں میں ایسے مسلم صحافی بھی تھے جو دو قومی نظریے سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ ایسے مسلم صحافیوں میں مرحوم مولانا محمد عثمان فقیہہ (مدیر روزنامہ ''الجمعیت'' دہلی، قومی مسلم تنظیم جمعیت العلمائے ہند سے وابستہ) اور مشہور و معروف صحافی مولانا عبدالباری باقی (مدیر روزنامہ ''پیام وطن'' دہلی) شامل تھے۔ مولانا عبدالباری باقی قیام پاکستان سے قبل مختلف صحافتی ذمے داریوں کی وجہ سے لاہور (مغربی پنجاب) جا چکے تھے۔ رجسٹرار نیوز پیپرس آف انڈیا کی سالانہ رپورٹ میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ 1957 میں ہندوستان میں اردو اخبارات اور جرائد کی کل تعداد 513 تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آزادی کے بعد پہلے عشرے میں گردش زمانہ اور سخت پریشانیوں کے باوجود اردو اخبارات اور جرائد کی تعداد میں 168 یا تقریباً 49 فی صد کا اضافہ ہوا۔ اس سے اردو زبان کی تخلیقی قوت عیاں ہوتی ہے۔ اردو اخبارات و جرائد کی کل تعداد اشاعت 784000 تھی جو کہ 513 اخبارات میں سے 292 کے ذریعے فراہم کیے گئے تعداد اشاعت کے اعداد و شمار پر مبنی تھے۔

یہ تعداد اشاعت ملک کی تمام زبانوں کے اخبارات کی کل تعداد اشاعت کا 7% تھی جبکہ اردو صحافت کا مقام انگریزی، ہندی اور تمل کے بعد چوتھا تھا۔

اس دور میں اردو صحافت کے ممتاز مدیروں میں مولانا محمد عثمان فقیہہ، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا محمد مسلم، مہاشے کرشن، مہاشے کوشل چند، دیوان سنگھ مفتون، لالہ دیش بندھو گپتا، میلا رام وفا، مولانا عبدالباری باقی، حیات اللہ انصاری، عبدالرزاق ملیح آبادی، رئیس الدین فریدی، میر عابد علی خاں، عبدالحمید انصاری، حکیم سید قمرالحسن، نندلال وِنل، جمنا داس اختر، گوپی ناتھ امن، تانک چند ناز اور سادھو سنگھ ہمدرد کے نام قابل ذکر ہیں۔ جمنا داس اختر کے علاوہ دیگر تمام حضرات اس دار فانی سے کوچ کر چکے ہیں تاہم آج بھی وہ اپنے انداز تحریر اور اسلوب کی وجہ سے یاد کیے جاتے ہیں اور اردو صحافت میں انھیں نمایاں مقام حاصل ہے۔ مختلف النوع خیالات اور طریق کار کے باوجود ان لوگوں نے نئے ہندوستان کی متحدہ قومیت کے لیے اتحاد اور بھائی چارے کی وکالت کی اور آزاد ہندوستان میں اردو صحافت کی بنیاد رکھی۔

ان میں سے بیشتر آزاد ہندوستان میں اردو کو نظر انداز کیے جانے اور اس کے تئیں بے توجہی سے ناخوش تھے کیونکہ حکومتی امور، تعلیمی، اداروں کے نصاب، دفتروں اور عدالتوں اور خصوصی طور پر اردو کی جائے پیدائش اتر پردیش، دہلی اور پنجاب (مشرق) میں اردو کو نظر انداز کیا گیا تھا۔

ان لوگوں نے محسوس کیا کہ اردو کو نظر انداز کیے جانے سے نئی نسل جس کی مادری زبان اردو تھی، اس کی ذہنی ترقی اور اس کا تعلیمی سفر بری طرح متاثر ہوا ہے۔ ان لوگوں نے مزید یہ خدشہ ظاہر کیا کہ اس عمل سے اردو صحافت کے قارئین کی تعداد کم ہو جائے گی۔

مزید اس بات کی وضاحت کی گئی کہ اردو زبان اور صحافت کی بقا میں ہی جمہوری اقدار اور اس کی اہمیت کا راز مضمر ہے۔

اردو صحافت اس وقت سے تقریباً ہر دہائی میں آزادی کی پچاسویں سالگرہ تک ترقی کی راہ پر گامزن رہی ہے اور اس کا اندازہ مندرجہ ذیل جدول (Table) سے لگایا جا سکتا ہے۔

سال	اخبارات کی تعداد	گذشتہ دہائی کے مقابلے میں اضافہ	تعداد اشاعت	گذشتہ دہائی کے مقابلے میں اضافہ
1957	513	98	784000	
1967	864	351	1358000	574000
1977	1047	183	1581000	223000
1987	1676	629	2806000	1225000
1997	2670	994	6166212	3060212

یہ بات واضح ہے کہ آزادی کے بعد کی پہلی دہائی سے ہی اردو صحافت میں اضافے کی شرح خاصی بہتر رہی ہے۔ آخری دہائی میں اس میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ یہ اضافہ اعداد و شمار کے اعتبار سے 1.59 گنا تھا اور تعداد اشاعت کے اعتبار سے 2.59 گنا تھا۔ 1947 کے اعداد و شمار کے مقابلے اس میں تقریباً 7 گنا اضافہ ہوا۔

آزادی کی پچاسویں سالگرہ یعنی 1997 اور بنیادی سال یعنی 1957 سے موازنہ کرنے پر یہ بات ہو جاتی ہے کہ اردو اخبارات میں تعداد کے اعتبار سے 2157 یا 4.2 گنا اضافہ ہوا اور تعداد اشاعت میں 5382212 یا تقریباً سات گنا اضافہ ہوا۔

ہر دور میں اردو اخبارات و جرائد میں یہ اضافہ اہمیت کا حامل رہا لیکن روزناموں کے حوالے سے یہ اضافہ غیر معمولی تھا۔ 1957 میں ان کی تعداد 71 تھی اور 1997 میں یہ تعداد 515 تھی، یعنی یہ تعداد بنیادی سال سے 6 گنا زیادہ تھی جب کہ تعداد اشاعت کے میدان میں یہ اضافہ 14 گنا تھا

یعنی 1957 میں 203000 کے مقابلے 1997 میں 2795625۔ ان اعداد وشمار کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ملک میں تقریباً 28 لاکھ لوگ ہر صبح اردو کے کسی نہ کسی اخبار کا مطالعہ کرتے تھے۔ تعداد کے اعتبار سے ملک میں اردو روزناموں کا مقام ہندی کے بعد دوسرا تھا۔

تعداد کے اعتبار سے اردو صحافت کا مقام 1997 میں ہندی اور انگریزی کے بعد تیسرا رہا جب کہ 1957 میں اس کا مقام چوتھا تھا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کیونکہ 1997 میں ملک میں 19 اہم زبانیں تھیں جب کہ 1957 میں صرف 16 اہم زبانیں تھیں۔ مزید یہ کہ 1957 میں صرف 10 ریاستیں اردو اخبارات شائع کرتی تھیں جب کہ 1997 میں یہ تعداد 17 ہوگئی بشمول مرکز کے زیر اختیار ایک ریاست (چنڈی گڑھ) کے۔ جن ریاستوں کا اضافہ ہوا ان میں ہریانہ، ہماچل پردیش اور چنڈی گڑھ (مرکز کے زیر اختیار) ریاستوں کا قیام 1966 میں مشرقی پنجاب کی تشکیل نو کے بعد ہوا۔ گجرات کو 1960 میں ریاست کا درجہ ملا اور باقی دو ریاستیں اڑیسہ اور راجستھان بھی 1957 کے بعد لسانی بنیاد پر وجود میں آئیں۔

آزادی کے بعد کی پہلی پانچ دہائیوں کے دوران ریاستی اعداد وشمار بھی اہمیت کے حامل تھے۔ مثال کے طور پر آندھرا پردیش میں اخبارات کی تعداد میں 18 گنا اضافہ ہوا اور تعداد اشاعت میں 26 گنا۔ بہار میں یہ اضافہ 13 گنا اور تعداد اشاعت میں 45 گنا تھا۔ کرناٹک میں یہ اضافہ تعداد میں 11 گنا اور تعداد اشاعت میں 6 گنا تھا۔ اتر پردیش میں یہ اضافہ تعداد میں 6 گنا اور تعداد اشاعت میں 23 گنا تھا۔ مہاراشٹر میں یہ اضافہ تعداد اور تعداد اشاعت دونوں میں 5 گنا تھا۔ مغربی بنگال میں یہ اضافہ تعداد میں 5 گنا اور تعداد اشاعت میں دو گنا تھا اور دہلی میں یہ اضافہ تعداد اور تعداد اشاعت میں 3.5 گنا تھا۔

دہلی، پنجاب اور اتر پردیش کو تقسیم وطن کی وجہ سے شدید نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ 1957 میں دہلی کا مقام تعداد اور تعداد اشاعت دونوں اعتبار سے سبھی ریاستوں سے آگے تھا۔ 1997 میں تعداد کے اعتبار سے اس کا مقام تیسرا تھا (اتر پردیش اور آندھرا پردیش کے بعد) اور تعداد اشاعت کے اعتبار سے اس کا مقام (اتر پردیش کے بعد) دوسرا تھا۔ اتر پردیش جسے اردو زبان کا گڑھ سمجھا جاتا تھا، تقسیم وطن کے دس برسوں کے بعد بھی یعنی بنیادی سال 1957 میں سب سے آگے نہیں تھا۔ بعد ازاں اتر پردیش نے اپنا مقام پھر سے حاصل کیا اور 1997 میں یہ ریاست اخبارات کی تعداد اور ان کی تعداد اشاعت دونوں کے اعتبار سے سبھی ریاستوں سے آگے تھی۔

اسی طرح آندھرا پردیش میں خاص طور سے اس کی راجدھانی حیدرآباد میں صورت حال نہایت شاندار رہی ہے۔ 1957 میں یہاں کل 27 اخبارات تھے جن کی تعداد اشاعت صرف 16292 تھی۔ 1997 میں یہاں اخبارات کی کل تعداد 479 اور تعداد اشاعت 419000 تھی۔ جنوبی ہند میں اردو اخبارات کی اشاعت کے معاملے میں فی الحال آندھرا پردیش تمام ریاستوں سے آگے ہے اور یہ ریاست کامیابی کے ساتھ شمالی خطے کے قائم شدہ قدیم مشہور اداروں کے ساتھ مسابقت کر رہی ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پنجاب تقسیم وطن کی تباہ کاری کے اثرات سے ابھی تک نکل نہیں پایا ہے۔ اخبارات کی تعداد اور تعداد اشاعت دونوں اعتبار سے 1957 میں اس کا مقام (دہلی اور اتر پردیش کے بعد) تیسرا تھا۔ 1997 میں یہ تعداد کے اعتبار سے آٹھویں مقام پر اور تعداد اشاعت کے اعتبار سے دسویں مقام پر پہنچ گیا۔ تقسیم وطن کی تباہ کاریوں سے متاثر ہونے کی وجہ سے یہاں اردو صحافت الگ تھلگ پڑ گئی۔ ایک ایسی ریاست جسے حالیہ زمانے تک اردو زبان کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور جہاں اردو صحافت کا ایک اہم اور فعال مرکز تھا، وہاں اب محض اس کی یادیں باقی رہ گئی ہیں۔ اس شکست خوردگی کے باوجود اس ریاست نے اپنی خصوصیت کو ترک نہیں کیا ہے۔ اس ریاست کا روزنامہ ''ہند سماچار'' (جالندھر) جس کی تعداد اشاعت لگاتار 25 برسوں تک (1996 تک) بڑے پیمانے پر برقرار تھی، اس کے دو مدیروں نے ملک کی سالمیت کے تحفظ کے لیے عظیم قربانیاں پیش کیں۔ یہ دونوں باپ بیٹے لالہ جگت نارائن اور رمیش چندر نے گمراہی میں مبتلا دہشت گردوں کے آگے ہتھیار ڈالنے کی بجائے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ یہ وہ دہشت گرد تھے جو گذشتہ صدی میں 1980 کی دہائی کے دوران اس ریاست کے لیے خطرہ بن چکے تھے۔

اردو صحافت کو جموں و کشمیر میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ہندوستانی وفاق میں شامل اس ریاست کے تحت تین اہم خطے ہیں اور ہر خطے کی ایک خاص مادری زبان ہے یعنی جموں میں ڈوگری، وادیٔ کشمیر میں کشمیری اور لداخ میں لداخی۔ لیکن ان خطوں میں کسی کے پاس بھی ان کی اپنی زبان کے لیے معقول پریس موجود نہیں ہے۔ یہاں کے مختلف خطوں میں اردو مقبول عام رابطے کی زبان کی حیثیت سے خدمت انجام دیتی ہے۔ ہندوستان میں اس کی شمولیت کے روز اوّل سے ہی اردو یہاں کی سرکاری زبان ہے۔

اس ریاست میں پانچ زبانوں انگریزی، ہندی، کشمیری، پنجابی اور اردو

میں اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ 1965 میں ترمیم شدہ قانون برائے پریس اور اندراج کتب (Press and Registration of Books Act) کے اطلاق کے بعد یہاں اخبارات کے سروے کا کام 1966 میں شروع ہوا۔ آر این آئی کی رپورٹ کے مطابق 1966 میں اس ریاست سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کی کل تعداد 55 تھی جس میں نو روزنامے، دو سہ روزہ، دو ہفت روزہ، 38 ہفت روزہ، 5 پندرہ روزہ اور ایک ماہنامہ شامل تھا اور ان کی کل تعداد اشاعت 54000 تھی۔ 1997 میں آزادی کی پچاسویں سالگرہ پر اس کی کل تعداد 220 تک پہنچ گئی یعنی 1966 کے مقابلے اس میں چار گنا اضافہ ہوا جس میں 56 روزنامے، تین سہ روزہ، دو ہفت روزہ، 135 ہفت روزہ، 13 پندرہ روزہ، 10 ماہنامے، دو سہ ماہی اور ایک ششماہی شامل تھے اور ان کی کل تعداد اشاعت 204136 تھی اور اس میں 1966 کے مقابلے 3.78 گنا اضافہ ہوا تھا۔ اس ریاست کے اردو اخبارات کی تعداد 1997 میں 220 تھی اور یہ تعداد ریاست کی ان پانچ زبانوں میں سب سے زیادہ تھی جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہندوستانی اردو صحافت کی یہ انفرادیت صرف جموں و کشمیر تک ہی محدود ہے۔ اردو صحافت نے جنگ آزادی میں تاریخی کردار ادا کیا اور اس آمرانہ ریاست میں جمہوری حکومت کے قیام اور اکتوبر 1947 میں ہندوستانی وفاق میں اس کی باضابطہ شمولیت کے لیے سیاسی تحریک کو فروغ دینے میں اس نے شاندار خدمات انجام دیں۔

ستمبر 1982 میں پہلے جمہوری وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کی وفات کے بعد یہ ریاست حالیہ دہائیوں میں سخت آزمائشی دور سے گزری ہے۔ ان تمام حالات کے باوجود اس ریاست کا کشمیریت سے بنیادی لگاؤ جو کہ انسانیت، سیکولرزم اور امن و آشتی کی وراثت پر مشتمل ہے، آج بھی قائم ہے۔

2002 آر این آئی کی رپورٹ (2002) کے مطابق تعداد کے لحاظ سے یہاں 1966 کے مقابلے، 2001 میں 4.5 گنا اضافہ ہوا جس میں 64 روزنامہ، تین سہ روزہ/دو روزہ، 153 ہفت روزہ، 16 پندرہ روزہ، 11 ماہنامہ، تین سہ ماہی شامل تھے اور کل تعداد اشاعت 99489 تھی۔ تاہم اس ریاست میں اردو صحافت کا مقام تعداد اشاعت کے لحاظ سے انگریزی پریس کے بعد دوسرا تھا کیونکہ انگریزی پریس کی تعداد اشاعت رپورٹ کے مطابق 490007 تھی۔

سرکاری رپورٹ کے مطابق گذشتہ صدی کے ربع آخر تک اردو صحافت نے سوائے پنجاب کے تمام ریاستوں میں تعداد اور تعداد اشاعت کے اعتبار سے ارتقائی سفر طے کیا ہے۔

تاہم سرکاری اعداد و شمار کو صحیح نہیں مانا جاسکتا۔ آر این آئی کی 1998 کی رپورٹ کے مطابق ''اس رپورٹ کو ترتیب دینے کے لیے ان اطلاعات کو خاص ذریعہ بنایا جاتا ہے جو اخبارات و جرائد کے ناشرین پریس اینڈ رجسٹریشن آف بکس ایکٹ 1867 کی شق 19 ڈی. کے تحت سالانہ پیش کرتے ہیں (دیباچہ ص iii)۔

متذکرہ رپورٹ کے مطابق ''ملک میں چونکہ بڑی تعداد میں اخبارات و جرائد شائع ہوتے ہیں اس لیے محدود عملے اور وسائل کے ساتھ ہر سال تمام اخبارات کی تعداد اشاعت کی تصدیق ممکن نہیں ہے۔'' (ص 226)

مزید کہا گیا ہے کہ'' یہاں یہ بتانا برمحل ہوگا کہ اخباری اداروں کے اہم طبقے خاص طور سے مختصر زمرے (جس سے بیشتر اردو پریس کا تعلق ہے)، ایسا لگتا ہے کہ رجسٹرار نیوز پیپر آف انڈیا آفس کو پی اینڈ آر بی ایکٹ کے تحت اپنی سالانہ رپورٹ پیش کرنے کی ذمے داریوں سے ناواقف ہیں۔ اس لیے ان کی صحیح تعداد اشاعت معلوم ہونا ممکن نہیں۔

جو سالانہ تعداد اشاعت یہ رپورٹ پیش کرتی ہے، ممکن ہے ہندوستانی پریس کی سالانہ تعداد اشاعت اس سے زیادہ ہو۔ (ایضاً ص 28)

تاہم آر این آئی کی تازہ ترین دستیاب رپورٹ (ہندوستان میں پریس 2002) میں اس بیان کی ترمیم اس طرح کی گئی ہے'' آر این آئی نے 51960 مندرج اشاعتوں کی سالانہ پیش کش میں فراہم کردہ معلومات کی تصدیق نہیں کی، کیونکہ 31 دسمبر 2001 تک صرف 5055 (اشاعتوں) نے اپنے سالانہ بیانات جاری کیے تھے۔ اس لیے اس رپورٹ میں دی گئی کسی بھی جانکاری کو آر این آئی کے ذریعے تسلیم شدہ تصور نہیں کیا جاسکتا۔'' (حوالہ 2002 کی رپورٹ کے ابتدائی صفحات۔)

مزید رپورٹ کے عام تبصرے میں آر این آئی کا یہ کہنا کہ ان حالات میں اس رپورٹ کو'' عام رجحان کا اشاریہ کہا جاسکتا ہے۔'' (صفحہ-1)

اس رپورٹ کے مطابق 2001 میں کل 2906 اردو اخبارات میں سے صرف 275 نے اپنی تعداد اشاعت کے اعداد و شمار جاری کیے۔ اس کل جمع میں 534 روزنامے، 21 روزہ یا سہ روزہ، 1348 ہفت روزہ، 377 پندرہ روزہ، 533 ماہنامے، 72 سہ ماہی، تین سالنامے اور 18 دیگر جریدے شامل ہیں۔

یہ اخبارات اور جرائد 19 ریاستوں اور ایک مرکز کے زیر انتظام علاقے سے شائع ہوتے ہیں، جسے درج ذیل جدول میں پیش کیا گیا ہے:

ریاست/مرکز کے زیر انتظام خطہ	اخبارات کی کل تعداد	کل تعداد اشاعت
آندھرا پردیش	495	3,27,116
بہار	159	6,82,805
چنڈی گڑھ	03	فراہم نہیں کیا گیا
چھتیس گڑھ	01	فراہم نہیں کیا گیا
دہلی	488	11,43,454
گجرات	02	فراہم نہیں کیا گیا
ہریانہ	17	2.250
ہماچل پردیش	06	فراہم نہیں کیا گیا
جموں وکشمیر	251	99,489
جھارکھنڈ	12	فراہم نہیں کیا گیا
کرناٹک	133	1,75,537
مدھیہ پردیش	30	77,397
مہاراشٹر	218	2,16,094
اڑیسہ	05	1000
پنجاب	105	66,556
راجستھان	22	فراہم نہیں کیا گیا
تمل ناڈو	17	43,541
اترانچل	14	3,510
اتر پردیش	858	20,24,675
مغربی بنگال	70	2,00,008
کل	2906	51,16,182

اس مجموعی تعداد میں ایک بڑا اخبار (تعداد اشاعت 75,000 کاپی سے زیادہ)، 81 اوسط درجے کے (تعداد اشاعت 25,001 سے 75,000 کاپی تک)، 193 چھوٹے (تعداد اشاعت 5,000 کاپی تک) اور بقیہ 2631 کو چھوٹے درجے کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

کل 2,906 میں سے 2,625 جرائد ذاتی ملکیت میں شائع ہوتے تھے۔ دوسری بڑی ملکیت (103) کاروباری اداروں اور ساجھے داروں کی تھی۔ اس کے بعد 95 سوسائٹی یا تنظیم، 22 پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی، 14 ٹرسٹ اور ریاستی حکومتوں، 9 مرکزی حکومت، 8 تعلیمی اداروں اور سیاسی جماعتوں، پبلک لمیٹڈ کمپنی اور اردو کوآپریٹو سوسائٹی کے زیر اہتمام شائع ہوتے تھے۔

(ایضاً ص 61)

اگرچہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستانی اردو پریس نے تمام نامساعد حالات کے باوجود تقسیم کے المیے کی پہلی نصف صدی کا سفر نہایت خوش اسلوبی سے طے کیا لیکن حالیہ رجحانات اطمینان بخش نہیں ہیں۔ 1997 میں اردو روزناموں کے قارئین کی تعداد میں 1996 کے اعداد وشمار کے مقابلے سات فیصد کی کمی واقع ہوئی اور یہ کمی ان ریاستوں میں ظاہر ہوئی جہاں اردو اخبارات کی مقبولیت کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ مثلاً اردو اخبارات بہار میں 2,14,682، آندھرا پردیش میں 1,41,655 اور مہاراشٹر میں 34,259 قارئین سے محروم ہوگئے۔ علاوہ ازیں ملک کے 20 پندرہ روزہ اور ہفت روزہ میں سے کسی کی تعداد اشاعت قابلِ ذکر نہیں ہے۔

تازہ ترین رپورٹ (2002) کے مطابق اردو اخبارات و جرائد کی کل تعداد اشاعت 2000 کے 61,20,317 کاپی کے مقابلے 2001 میں 51,16,182 کاپی ہوگئی۔ (یعنی دس لاکھ کاپی سے زیادہ یا 16.41 فیصد کی کمی)۔ حالیہ برسوں میں کمی کا یہ سلسلہ لگاتار جاری ہے۔ 1999 میں کل تعداد اشاعت 80,28,072 تھی جو 2000 میں گھٹ کر 61,20,317 ہوگئی یعنی 19 لاکھ کاپی یا 23.8 فیصد کی کمی۔ اہم ریاستوں کی حالیہ تقابلی تصویر درج ذیل جدول میں پیش کی جارہی ہے۔

سال	ریاست	کل تعداد اشاعت	سال	کل تعداد اشاعت	کمی
2001	—	—	2000	—	—
2001	آندھرا پردیش	3,27,116	2000	5,06,731	1,79,615
2001	بہار	6,82,805	2000	8,17,212	1,34,407
2001	دہلی	11,43,454	2000	12,87,496	1,44,042
2001	پنجاب	66,556	2000	74,356	7,800

بغور دیکھا جائے تو اس کمی کے دو اسباب نظر آتے ہیں۔ پہلی وجہ مغربی پاکستان سے ہجرت کرکے آئے ایک بڑے اردوداں طبقے کی موت اور دوسری وجہ ریاستی حکومتوں کے ذریعے پرائمری سطح پر اردو تعلیم کی سہولیات فراہم کرنے سے انکار، جس سے تقسیم کے بعد کی دوسری اور تیسری نسل متاثر ہوئی۔ علاوہ ازیں سبھی آئینی زبانوں کو فروغ کا مساوی موقع فراہم کرنے کے لیے تمام ریاستوں کے اتفاق رائے سے تیار کیے گئے سہ لسانی فارمولے کا نفاذ متعدد

ریاستوں میں پرخلوص اور بامقصد طور پر نہیں ہوسکا۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ قارئین کی تعداد میں کمی تعداد اشاعت میں کمی کا باعث ہوگی، اشتہارات کے ذریعے حاصل ہونے والی آمدنی کے راستے بھی محدود ہوجائیں گے اور مایوس پبلشرز نہ تو اپنے کاروبار کو مزید مضبوطی فراہم کریں گے اور نہ ہی کسی نئے منصوبہ (Venture) کی شروعات کریں گے۔

یہ نہایت ہی مایوس کن صورت حال ہے اور ان مفاد پرست سیاست دانوں کے لیے لمحۂ فکر یہ بھی ہے جنھوں نے گذشتہ 57 برسوں میں اردو کے فروغ کے لیے بے شمار وعدے کیے ہیں۔ لیکن اردو صحافت کے خیرخواہوں کو اس صورت حال سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

اگرچہ اردو صحافت قانونی طور پر نئے مواقع اور نئے راستے نکلنے کا انتظار کرسکتی ہے۔ تاہم اگر اس کے داخلی وسائل کو بروئے کار لایا جائے تو اس کے فوری اور مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔ مردم شماری کے تازہ ترین لسانی تجزیے (1991) کے اعداد وشمار کے مطابق اردو بولنے والوں کی تعداد 4,34,06,932 ہے، اگر اس آبادی کے صرف نصف بالغ افراد کو اپنے علاقے سے شائع ہونے والے ایک روزنامے اور ایک رسالے کی خریداری پر رضامند کرلیا جائے تو اردو صحافت کے لیے نئے امکانات فوری طور پر روشن ہوجائیں گے۔

صرف اردو صحافت ہی اس انحطاط کی کیفیت سے نہیں گزر رہی ہے بلکہ زیادہ تر زبانوں کی صحافت (Language Press) کی یہی صورت حال ہے۔

فیصلہ سازی (Decision Making) کی سطح پر زبان اور علاقائی اخبارات کے مسائل کے تئیں عام طور ہمدردانہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور لگاتار یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی صحافت کا مستقبل زبانوں کی صحافت میں مضمر ہے۔ تاہم اس دعوے کی تصدیق نہ تو کسی منصوبہ بند اور قابل برقرار خصوصی صحافتی پالیسی کے تحت ہوسکی اور نہ ہی اس کی پیشہ ورانہ صلاحیت بڑھانے کی کوشش کی گئی اور اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً اشتہارات اور کاغذ کے کوٹے کی فراہمی کو ہی کافی سمجھا گیا۔

زبانوں کی صحافت جس کی رسائی انگریزی اخبارات کے پانچ فیصد کے مقابلے میں ملک کی ایک بڑی آبادی تک ہے، کے مسائل اور دشواریوں کے عمیق مطالعہ کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی اور نہ ہی اس کے لیے مناسب اقدام کی سفارش کی گئی۔

آزادی کے حصول کے بعد صحافت کے فروغ کے لیے دو نہایت اہم پریس کمیشن تشکیل دیے گئے، جنھوں نے دو نہایت عالمانہ روئیداد پیش کیں۔ لیکن افسوس! دونوں رپورٹوں میں خصوصی طور پر انگریزی صحافت کے مختلف پہلوؤں اور مسائل پر توجہ مرکوز تھی اور اس میں توازن قائم رکھنے کے لیے بڑی مہارت سے زبانوں اور علاقائی صحافت کے حوالے بھی پیش کیے گئے۔ اس میں اس پریس کو دائمی پیشہ ورانہ صلاحیت فراہم کرانے پر زور نہیں دیا گیا۔

یہاں دوسرے پریس کمیشن کے ایک رکن شری جی وی گاڈگل کے مشاہدات کو نقل کرنا برمحل ہوگا۔ انھوں نے اپنے نوٹ میں کہا تھا کہ کمیشن نے ہندوستانی زبانوں کی صحافت کو بہتر بنانے میں درپیش مسائل پر بہت کم توجہ اور وقت صرف کیا۔ (جلد اوّل، ص-283) اس پریس کو نئی اطلاعاتی ٹیکنالوجی سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے۔ انگریزی پریس کے مقابلے میں اس کے سافٹ ویئر اپنے ابتدائی مرحلے میں ہیں اور اس سلسلے میں درپیش دشواریاں روز بروز بڑھتی جارہی ہیں۔

لیکن پھر بھی اپنی داخلی مستقل مزاجی اور تسلیم شدہ خوبی کے سہارے اردو صحافت بڑی مضبوطی سے ان پریشانیوں کا سامنا کررہی ہے۔ مختلف ریاستوں کے متعدد اردو اخبارات نے کمپیوٹر ٹائپ سیٹنگ اور ترقی یافتہ فوٹو آفسیٹ پرنٹنگ اختیار کرلیے ہیں۔ اب وہ دستی کاپی میکر یا کاتب کی خدمات کے بغیر بھی اخبار شائع کرسکتے ہیں۔ پچھلی صدی کی 80 کی دہائی تک کاتب اردو اخبارات کی اشاعت کا سب سے اہم جزو تھے۔ گو بعض اوقات وہ خودسر بھی ہوتے تھے لیکن اردو اخبار کی اشاعت کے لیے انھیں ناگزیر سمجھا جاتا تھا۔ نئی ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے استعمال سے اردو صحافت کو 150 سال سے رائج اکتا دینے والی لیتھوگرافی سے بھی نجات مل گئی ہے۔ تاہم زبانوں کے پریس کے لیے نئی اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے چیلنج کو کم نہیں گردانا جاسکتا۔

دوسرے پریس کمیشن نے تو News Paper Developmen Commision قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی، جس سے شاید ان میں سے زیادہ تر خامیوں کا ازالہ ہوجاتا اور زبان کی میڈیا کو پیشہ ورانہ مضبوطی بھی فراہم ہوجاتی لیکن اس تجویز کو اس وقت (راجیو گاندھی) کی حکومت نے مسترد کردیا۔

ہندوستانی زبانوں کے فروغ کے حوالے سے اس کمیشن نے اس امر پر زور دیا کہ زبان کی ترقی کا تخمینہ اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے لگایا جائے۔ جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ ملک کے چار کروڑ سے زیادہ افراد نے اردو کو اپنی مادری زبان تسلیم کیا ہے۔ مزید برآں اردو پریس مسلم برادری کے ایک بڑے طبقے کے مسائل، امنگوں اور آرزوؤں کی ترجمانی کرتا ہے۔ ملک کی 1.06 ارب آبادی (جون 2003) میں سرکاری اعداد وشمار کے مطابق مسلمانوں کی تعداد 12 کروڑ (120 ملین) ہے، جو انڈونیشیا کے بعد کسی ایک ملک میں دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی ہے۔ مزید یہ کہ دنیا کی سب سے بڑی اردو داں آبادی ہندوستان میں ہی رہتی ہے۔

اپنی دلکشی اور شگفتگی کی وجہ سے اردو زبان کی مقبولیت دوردراز کے

علاقوں تک پہنچ گئی ہے۔ حالیہ برسوں میں متعدد ممالک بالخصوص برطانیہ، امریکہ اور خلیج کے ممالک میں اس کے نئے صحافتی مراکز قائم کیے گئے ہیں۔ اس زبان میں ہمسایہ ملک پاکستان کے ساتھ رشتوں کی خلیج کو استوار کرنے کی غیر معمولی صلاحیت موجود ہے۔ کیونکہ پاکستان میں محدود لسانی ماحول کے باوجود اردو سرکاری زبان ہے۔ 6 جنوری 2004 کو سارک چوٹی کانفرنس کے دوران ہندوستانی وزیر اعظم شری اٹل بہاری واجپئی اور پاکستانی صدر جنرل پرویز مشرف کے ذریعے جاری کیے گئے مشترکہ اعلامیہ کے بعد ہندوپاک تعلقات میں جو بہتری آئی وہ اردو پریس کی عملی صلاحیتوں سے براہ راست مربوط ہے۔ تاہم دیگر تمام زبانوں کے پریس کی طرح اردو پریس کی پیشہ ورانہ اور عملی صلاحیت کو منصوبہ بند طریقے سے فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ چند اخبارات اور صحافیوں کو انفرادی طور پر مالی امداد اور اسی طرح کے دوسرے نسخے بہم پہنچانے سے گریز کرتے ہوئے پیشہ ورانہ طور پر کمزور تمام علاقائی پریس کے ترقیاتی منصوبوں کا تجزیہ کرنا ہوگا۔

دوسرے پریس کمیشن کے ذریعے تجویز کردہ اخبارات کے ترقیاتی کمیشن (Newspaper Development Commission) نے ملک کے عوام کی خواہشات اور آواز کی نمائندگی کرنے والے مختلف علاقوں کے چھوٹے اور اوسط درجے کے اخبارات کے معیار، حیثیت، عملی اقدام اور مستقبل کے ترقیاتی پروگراموں کی بہتری کے لیے تعمیری اور ترقیاتی اقدام کی توثیق کی۔

(دوسرے پریس کمیشن کی رپورٹ، جلد ا ص 1005)

اس تجویز کو دو دہائی قبل 1986 میں مسترد کردیا گیا۔ لیکن اب پوری ملینیم (Millennium) تبدیل ہو چکی ہے۔ علاقائی آوازیں اور مختلف دعوے سامنے آگئے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا ہندوستانی کے ذریعے علاقائی اخبارات کے قارئین تک پہنچ رہا ہے۔ یہاں تک کہ یہ ان ناخواندہ افراد تک رسائی حاصل کررہا ہے جو مستقبل میں علاقائی پریس کے قاری ہو سکتے ہیں۔

لازمی ہے کہ اس مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے۔ اس مسئلے کا فوری تقاضہ ہے کہ اس کے لیے ایک مخصوص کمیشن کا قیام عمل میں آئے جو علاقائی پریس کی صورت حال میں اصلاح کے لیے تجاویز پیش کرے۔ علاوہ ازیں جملہ آئینی علاقائی زبانوں کے دو تجربے کار صحافیوں کو اس عملے میں شامل کیا جانا چاہیے۔

* * *

اردو کے ابتدائی ادبی معرکے (ابتدا سے عہد [illegible] تک)

مصنف: محمد یعقوب عامر

[illegible]

محمد یعقوب عامر نے اس کتاب میں ابتدا سے [illegible] تک کے ان ادبی معرکوں کا احاطہ کیا ہے [illegible]

صفحات: 251، قیمت -/22 روپے

کرزی کہانی

راجا کھی (ایک جاتک کہانی)، لالو بندر نھو مگرمچھ (پنچ تنتر کہانی) رنگیلا گیدڑ (پنچ تنتر کہانی)، بے سُرا ڈھونڈو (پنچ تنتر کہانی)

[illegible]

قیمت: (پورا سیٹ مع کیسٹ) -/280 روپے

اردو میں نظم معرّا اور آزاد نظم (ابتدا سے [illegible] تک)

مصنف: حنیف کیفی

مشرق و مغرب کی تہذیبی آویزش سے اردو شاعری نے جو اثرات قبول کیے ان میں نظم معرّا اور آزاد نظم کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اس سے اردو شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ حنیف کیفی کی یہ کتاب ان تجربات کی مربوط تاریخ بھی ہے اور ان کا علمی تجزیہ بھی۔ مصنف نے پیش کردہ حقائق کی معروضی [illegible] اور اردو نظم کی روایت کو سمجھنے کے لیے ٹھوس بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔

صفحات: 608، قیمت: -/182 روپے

انتخاب کلام حسرت

مرتب: فضل امام

بیسویں صدی میں اردو غزل کے احیا میں جن شعرا نے اہم کردار ادا کیا ان میں سید فضل الحسن حسرت موہانی کو امام المتغزلین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں حسرت کے غزلیہ کلام کا ایک جامع انتخاب پیش کیا گیا ہے اور شروع میں ان کے شاعرانہ امتیازات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 91، قیمت: -/9 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: راجیش کسیرا
ترجمہ: رئیس احمد

حبیب تنویر سے گفتگو

ہندوستانی تھیٹر سے گذشتہ سات دہائیوں سے وابستہ حبیب تنویر نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو تھیٹر کے ذریعے اسٹیج پر پیش کیا ہے، انھوں نے اردو، ہندی، مالوی، بندیلی، اودھی، چھتیس گڑھی، انگریزی اور سنسکرت جیسی زبانوں اور بولیوں کو بھی ادائے مطلب کے لیے استعمال کیا ہے۔ 82سال کی عمر میں حبیب تنویر نہ صرف ہندوستان کے بلکہ دنیا کے ایک ایسے ڈراما ہدایت کار ہیں جنھوں نے 55برسوں تک ایک ہی ناٹک منڈلی، ایک ہی گروپ اور پیش کش کے ایک ہی اسلوب کو برقرار رکھا۔ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک حبیب تنویر ایک بہترین اداکار اور ہدایت کار ہی نہیں بلکہ ایک اچھے شاعر، نغمہ نگار، بہترین مصور اور عبقری صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان سے کی گئی گفتگو کے اقتباسات قارئینِ "اردو دنیا" کی نذر ہیں۔

سوال: گذشتہ دنوں مدھیہ پردیش حکومت نے آپ کے ڈراموں کی پیش کش پر روک لگا دی ہے، اور آپ کی انجمن کو ملنے والی رعایت کو بھی ختم کردیا۔ یہ سب کچھ اچانک ہوا، آپ کیا سوچتے ہیں؟

جواب: جیسے انھوں نے اپنا کام کیا اور ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ حبیب تنویر اپنے ڈراموں میں مذہب اور ذات پات مخالف مناظر کو پیش کر رہے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہے۔ "جس لاہور نہیں دیکھیا وہ جمیا ہی نہیں" اور "پونگا پنڈت" دونوں ہی ڈراموں کو لکھنے والے جدا جدا افراد ہیں۔ میں تو محض ان کا ہدایت کار ہوں ـــ اصغر وجاہت کے ڈرامے میں میں نے وہی منظر پیش کیا ہے جو ایک ڈراما نگار کے جذبات تھے، اسی طرح سے "پونگا پنڈت" تو چھتیس گڑھ میں سابقہ 75 برسوں سے اسٹیج پر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ ڈراما پہلی بار میں نے 1960 میں دیکھا۔ میں نے عوامی اسلوب کے اس موضوع کو عمدہ تکنیک اور سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا، یہ مذہبیت، روحانیت اور ہندوازم کے سچے اصولوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جسے میں نے 1970 سے اب تک "نکڑ شیلی"، "ناٹک شیلی" اور ڈراما اداکاری کے مختلف اسالیب اور صورتوں میں بارہا پیش کیا ہے۔ اب حکومت اس کی مخالفت میں کھڑی ہو رہی ہے، تو ہو۔ ہماری رنگ یاترا، تو جاری تھی، جاری ہے اور جاری رہے گی۔

سوال: دونوں ڈراموں کو لے کر ماضی میں بھی تنازعہ ہوا ہے؟

جواب: ہم کسی کی سوچ کو باندھ کر تو نہیں رکھ سکتے۔ دنیا میں ایک ہی سوچ اور فکر کے لوگ آجائیں گے تو دنیا یا تو جنت بن جائے

حبیب تنویر کا نام **حبیب احمد خاں** اور تخلص **تنویر** ہے۔ وہ بچپن سے ہی فلموں میں کام کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ ان کے والد انھیں انڈین سول سروس (آئی سی ایس) کا افسر بنانا چاہتے تھے، حبیب تنویر نے ابتدائی دور میں کئی برسوں تک فلمی تجزیہ نگار کی حیثیت سے کام کیا۔ وہ فلم انڈیا، ٹیکسٹائل جرنل، برماشیل میگزین، باکس آفس اور کئی روزنامہ اخباروں سے بھی وابستہ رہے۔ انھیں سب سے زیادہ شہرت ناٹک "آگرہ بازار"، "چرن داس چور"، "جس لاہور نہیں دیکھیا وہ جمیا ہی نہیں" اور "مٹی کی گاڑی" سے ملی لیکن خود انھیں چھتیس گڑھ لوک شیلی کا ناٹک "بہادر کلارن" سب سے زیادہ پسند ہے۔ کیریئر کی شروعات میں شاعری کے شوقین حبیب تنویر کی غزلوں کا پہلا مجموعہ "نیا ادب" میں شائع ہوا، اس وقت "نیا ادب" کے ایڈیٹر علی سردار جعفری تھے۔ انھوں نے بلراج ساہنی اور دینا پاٹھک کی ہدایت میں اداکاری کی شروعات کی۔ 1971 میں انھیں سنگیت ناٹک اکادمی کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ 1972 میں وہ راجیہ سبھا کے ممبر منتخب ہوئے۔ حبیب تنویر نے ایم ایس ستھیو کی فلم "گرم ہوا" رچرڈ اٹنبرو کی "گاندھی"، سدھیر مشرا کی "یہ وہ منزل تو نہیں" گوتا دیسائی کی بچوں کی فلم "مجھ سے دوستی کرو گے" اور نانا پاٹیکر کی "پرہار" میں کام کیا۔ ٹی وی سیریل "کب تک پکاروں" میں انھوں نے منفی کردار ادا کیا۔ آپ کے ناٹک "چرن داس چور" پر شیام بینیگل نے 1975 میں اسی نام سے فلم بھی بنائی۔ آپ کی شریک حیات مونکا مشرا بھی ڈراما آرٹسٹ رہی ہیں۔ آپ کی بیٹی کا نام نگین تنویر ہے۔

گی یا پھر دوزخ۔ میں نے "پونگا پنڈت" 1992 میں ایسے وقت میں اسٹیج کیا جب بابری مسجد کو شہید کیا گیا تھا۔ دلی کے شری رام سینٹر، جے این یو، دلی یونیورسٹی اور بعض دیگر مقامات پر ڈرامے کے کئی شو ہوئے۔ 1993 میں اس کی ایک پیش کش ایودھیا میں بھی ہوئی۔ کہیں کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اسی سال جب ہم فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے شہر گوالیر میں منعقد ایک جلسے میں ڈراما پیش کر رہے تھے تو پہلی بار سنگھ پریوار کے لوگوں نے اس پر اعتراض کیا، اس کے باوجود ہم نے ڈرامے کا شو پورا کیا۔ اب اچھے برے حالات تو ہر پیشے میں آڑے آتے ہیں۔ ضرورت ہے ان سے مقابلہ کرنے کی، نہ کہ ان سے گھبرا کر ہمت ہارنے کی۔

حبیب تنویر کی اداکاری کے سفر میں یوں تو پچاس سے زیادہ ڈراموں کے ہزاروں اسٹیج شو شامل ہیں، جنھیں ناظرین نے دل سے پسند کیا۔ ان کے ذریعے اسٹیج کیے گئے اہم ڈرامے "شطرنج کے مہرے" (پریم چند کی کہانی) "آگرہ بازار"، "ٹیمنگ آف دی ٹوتھ" (شیکسپیئر) "سون ساگر" (چھتیس گڑھی) "گاؤں کا نام سسرال۔ مور کا نام داماد" (چھتیس گڑھی) "مٹی کی گاڑی" (سنسکرت ناٹک مرچھ کٹکم) "چرن داس چور" (چھتیس گڑھی زبان میں وجیہ دان دیتھا کی کہانی) "مرزا شہرت بیگ" (اردو برزوا جینٹلمین (مولیئر کا ایڈوپٹیشن) "کام دیو کا اپنا بسنت رتو کا سپنا" (اردو۔ شیکسپیر کے مِڈسمر نائٹس ڈریم کا ترجمہ) "دی امپورٹینس آف بِگ ارنیسٹ" (انگریزی۔ آسکر وائلڈ) "بہادر کلارن" (چھتیس گڑھی) "ایک اور درونا چاریہ" (شنکر شیش) "موٹے رام کا ستیہ گرہ" (پریم چند کی کہانی) "جس لاہور نہیں دیکھیا وہ جمیا ہی نہیں" (اصغر وجاہت) "ایک عورت ہیپشیا بھی تھی" (حبیب تنویر) "پونگا پنڈت" (چھتیس گڑھی)۔

سوال: عصر حاضر میں اسٹیج نازک دور سے گزر رہا ہے پہلے کے مقابلے اسٹیج کی سرگرمیوں میں کمی آئی ہے، ان حالات میں ڈراما اداکاری کی کشتی کہیں ڈگمگا تو نہیں رہی ہے؟

جواب: ۔ یہ تو ہر دور کی حقیقت ہے لیکن واقعی آنے والا وقت بے حد چنوتیوں سے بھرا ہوا ہوگا۔ حکومت کی نظر چاہے ہر طرف ہو، لیکن ڈراما اداکاری کے لیے حکومت کے ذہن میں کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ ڈراما اداکار تو مفلس و نادار ہوتا ہے اسے تو محض ناظرین کی قدر دانی اور حکومت کی معمولی سی نظر عنایت ہی کافی ہے۔ پھر دیکھیے چاہے کتنا بھی بڑا طوفان کیوں نہ آجائے تھیٹر کی کشتی بلند ارادوں کے ساتھ آگے ہی بڑھتی رہے گی۔

سوال: اس کے لیے پہل کون کرے گا، کیا آپ اس کے لیے کچھ کر رہے ہیں؟

جواب: ان دنوں میرا زیادہ تر وقت اسی ادھیڑ بن میں رہتا ہے کہ کوئی تو ایسا سرا ہاتھ میں آئے جس سے منزل تک پہنچنا آسان ہو جائے۔ میں اسی موضوع پر لکھ رہا ہوں جس کے ذریعے میرے جذبات ان سبھی اسٹیج آرٹسٹوں تک پہنچ سکیں جن کے دلوں میں اسی طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ میں اسٹیج آرٹسٹوں کو غور و فکر اور تبادلۂ خیالات کے لیے مدعو کرنا چاہتا ہوں اور ان کے پیش نظر کچھ اہم باتیں اور سوالات رکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تھیٹر کے تمام پرستار متحد ہو کر اس جانب حکومت کی توجہ مرکوز کریں، تاکہ ہماری مشکلات او ر پریشانیوں سے حکومت واقف ہو سکے۔

سوال: آنے والے وقت میں آپ کی کون سی تخلیق ناظرین کو دیکھنے کو ملے گی؟

جواب: اس وقت میں رویندر ناتھ ٹیگور کی تخلیقات پر کام کر رہا ہوں، اسے میں نے "وِسرجن" کا نام دیا ہے۔ ٹیگور کا ادب انسانی فکر کو ٹٹولنے اور سمجھنے کا مادّہ رکھتا ہے۔ اس عظیم مصنف، شاعر، مفکر، ادیب، تجزیہ نگار اور محب وطن کی تحریروں میں بہت کچھ تھا۔ جلد ہی "وسرجن" ناظرین کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ آج کل میں اترا کھنڈ اور مغربی بنگال میں "پونگا پنڈت" کے اسٹیج شو کرنے میں مصروف ہوں۔

سوال: آپ کو اپنی ستّر سالہ تھیٹر سے وابستہ زندگی میں کبھی کوئی ملال ہوا؟

جواب: نظیر کا ایک شعر ہے۔

ناز اٹھانے میں جفائیں تو اٹھائیں، لیکن
لطف بھی ایسا اٹھایا کہ جی جانتا ہے

کسی بھی تھیٹر اداکار سے پوچھیے کہ کیا اس سے تھیٹر کی لت کبھی چھوٹ سکتی ہے، تو اس کا یہی جواب ہوگا۔

(بشکریہ "راجستھان پتریکا" نئی دہلی، 16 اکتوبر 2005)

□□□

سید اقبال امروہوی

کارل یونگ

(ایک عظیم مفکر، فلسفی اور ماہر نفسیات)

کارل یونگ کا جب ذکر آتا ہے تو ساتھ ہی سگمنڈ فرائڈ کا نام بھی ذہن میں آجاتا ہے کیونکہ یونگ کو عام طور پر فرائڈ کے شاگردوں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر کارل یونگ فرائڈ سے نہ بھی ملتا تو بھی وہ ایک عظیم مفکر، بلند پایہ فلسفی اور دانشور ہوتا کیونکہ اس کی اپنی شخصیت ان تمام خصائص کی حامل تھی جو ایک دانشور میں ہونا ضروری ہیں۔ یونگ سوئزرلینڈ کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا خاندان تعلیم یافتہ تھا ساتھ ہی مذہبی امور میں بھی پیش پیش رہتا تھا۔ اس کے خاندان میں کئی افراد چرچ سے وابستہ تھے اور کئی پادری بھی تھے۔ یونگ کے والد نے اس کو لاطینی زبان سیکھنے کے لیے ایک مکتب میں داخل کردیا جہاں اس کی طبیعت میں قدیم زبانوں کو سیکھنے اور ان کے ادب کے مطالعے کا رجحان پیدا ہوا۔ اس کا یہ رجحان جب نمو پایا تو اس نے اپنی عمر کے ایک دور میں مختلف ممالک کا دورہ کیا اور وہ ہندوستان بھی آیا جہاں اس نے سنسکرت زبان سیکھی تاکہ وہ ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتابوں سے استفادہ کرسکے۔

یونگ کو اس مکتب سے نکل کر بیسل میں ہی ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کردیا گیا۔ اس اسکول میں داخلے کے بعد اس میں تنہائی پسندی کا رجحان پیدا ہوگیا اور وہ زیادہ تر اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھتا تھا۔ وہ اپنی تعلیم کی طرف بھی زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا خاص طور پر وہ تعلیمی مقابلوں سے بہت گھبراتا تھا اور ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے بیماری کا بہانہ کرکے الگ پڑا رہتا۔ وہ خود اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ بورڈنگ اسکول کی زندگی میں وہ اپنے آپ کو ایک نفسیاتی مریض سمجھنے لگا تھا کیونکہ جب اس پر تناؤ کی زیادتی ہوتی تو وہ بیہوش ہوجاتا تھا۔ اسکول کی تعلیم مکمل کرکے وہ بیسل یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ اس کی دلچسپی علم آثار قدیمہ میں تھی لیکن اس کے والد اس کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے لہٰذا اپنے والد کی خوشی کے لیے اس نے ڈاکٹری کا پیشہ اپنایا۔ یونیورسٹی میں اس کو مشہور نیورولوجسٹ ڈاکٹر Krafft.Ebing کا ساتھ ملا اور ان کے مشورے سے یونگ نے نفسیات کا شعبہ اپنانے کا فیصلہ کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے زیورک میں ہی ایک دماغی امراض کے اسپتال میں ملازمت اختیار کرلی۔ اسپتال میں ڈاکٹر بلائلر کے ماتحت کام کرنے کا موقعہ ملا۔ ڈاکٹر بلائلر بذات خود ایک مشہور اور نفسیاتی امراض کے ماہر ڈاکٹر تھے۔ ان کا نام آج بھی مشہور ہے کیونکہ انھوں نے ہی اسکیزوفرینیا کی بیماری کی پہچان کی اور اس کو یہ نام بھی انھوں نے ہی دیا۔ ان حالات میں یونگ کی شخصیت میں نکھار آیا اور وہ اپنے شعبے میں کافی دلچسپی لینے لگا۔ کچھ عرصے بعد اس کو اپنا ذاتی دواخانہ کھولنے کی اجازت بھی مل گئی، ساتھ ہی وہ یونیورسٹی میں لیکچر بھی دینے لگا۔

کارل یونگ کی شخصیت کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ وہ خود بعض نفسیاتی الجھاؤ کا شکار تھا۔ وہ بچپن سے ہی اپنے خوابوں کے بارے میں کافی پریشان رہتا تھا کیونکہ خوابوں میں عجیب وغریب حالات دیکھتا تھا۔ وہ جب اپنے گھر والوں سے اپنے خواب بیان کرتا تو وہ بھی پریشان ہوجاتے تھے کیونکہ اس کے خوابوں میں اکثر مذہبی رہنماؤں اور مقدس مقامات کی بے حرمتی کا اشارہ ملتا تھا اور اس قسم کے خوابی مواد سے خود یونگ بھی خوف زدہ ہوجاتا تھا کیونکہ وہ کبھی کبھی خواب میں ایک ایسے معبود کو دیکھتا تھا جس کی شبیہ ایک بڑے مردانہ عضو سے مشابہت رکھتی تھی۔ اس قسم کے خوابوں کی وجہ سے اس میں ان کی حقیقت مان لینے کی ایک تڑپ پیدا کردی۔ اس سلسلے میں اگر اس کا موازنہ فرائڈ سے کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یونگ فرائڈ سے زیادہ اپنے خوابوں کی حقیقت جاننے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ وہ نہ صرف اپنے خوابوں کا ریکارڈ رکھتا تھا بلکہ وہ اپنے دوستوں اور اپنے مریضوں کے خواب بھی بہت دلچسپی سے سنتا تھا۔ وہ اپنے مریضوں سے کہتا تھا کہ اگر انھوں نے کوئی عجیب سا خواب دیکھا ہو تو وہ بیان کریں۔

خوابوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی پیاس ہی فرائڈ سے اس کی ملاقات کا سبب بنی۔ اس وقت تک فرائڈ کے نظریات کے بارے میں بحث شروع ہوچکی تھی لیکن فرائڈ کے نظریات سے زیادہ وہ اس کی پہلی کتاب Interpretation of Dreams سے زیادہ متاثر ہوا اور اس نے فرائڈ سے ملاقات کا ارادہ کرلیا۔ لیکن 7 سال تک وہ فرائڈ سے ملنے کے منصوبے پر عمل نہیں کرسکا۔ ان سات برسوں میں فرائڈ کو کافی شہرت مل چکی تھی اور اس کی تحلیل نفسی کی تحریک زور پکڑنے لگی تھی۔ فرائڈ

ویانا میں اپنے گھر ہر بدھ کے دن ان لوگوں سے ملاقات کرتا تھا جو اس تحریک کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یونگ نے 1907 میں ویانا آ کر ایسی ہی ایک میٹنگ میں شرکت کی۔ فرائڈ یونگ سے مل کر اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنے پورے دن کی مصروفیات رد کردیں اور یونگ کے ساتھ مسلسل 13 گھنٹے تک بات چیت کرتا رہا۔ دو فلسفیوں کی آپس میں گفتگو سے یونگ سے زیادہ فرائڈ متاثر ہوا اور اس نے سوچا کہ یونگ میں وہ صلاحیتیں موجود ہیں جو اس کے نظریات اور اصولوں کی روشنی میں اس کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہیں۔

1909 میں فرائڈ کو امریکہ کی کلارک یونیورسٹی میں لیکچر دینے کی دعوت ملی تو وہ یونگ کو بھی اپنے ساتھ لے گیا اور وہاں اس نے یونگ کو اپنے جانشیں کی حیثیت سے متعارف کرایا اور یہی وجہ تھی کہ اس کے بعد کلارک یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے لیے اکیلے یونگ کو ہی دعوت دی جانے لگی۔ اس سال جب ویانا میں فرائڈ نے International Psychoanalitic Association کی بنیاد ڈالی تو کارل یونگ کو اس کا پہلا صدر نامزد کیا۔ اس وقت ویانا میں یہودیوں کی آبادی کا غلبہ تھا اور ان لوگوں کو فرائڈ کی یہ بات ناگوار گزری کہ اس نے اس ایسوسی ایشن کا پہلا صدر ایسے شخص کو بنایا جو یہودی نہیں تھا۔ لیکن اس سلسلے میں فرائڈ کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ یہودیوں کے خلاف بڑھتے ہوئے تعصب کے رجحان سے یہ ایسوسی ایشن محفوظ رہے اور اس نے مقامی لوگوں کو اس سلسلے میں راضی کرلیا۔

فرائڈ بہت ضدی تھا اور تحکمانہ مزاج رکھتا تھا۔ وہ ہر شخص پر اپنے خیالات کو حاوی کرنے کا عادی تھا اور تنقید سے تو اس کی ہیجانی کیفیت کچھ عجیب سی ہو جاتی تھی۔ فرائڈ کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ یونگ ایسوسی ایشن کے انتظام میں اس کی توقعات کو پورا نہیں کر رہا ہے ساتھ ہی فرائڈ نے یہ بھی محسوس کیا کہ یونگ اس کے نظریات کو سو فی صد تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس نے لبیڈو کے مفہوم کو بھی بدل دیا اور کلارک یونیورسٹی کے ایک لیکچر میں اس نے فرائڈ کے نظریہ جنس کی بھی مخالفت کی تو فرائڈ یہ برداشت نہ کرسکا اور 1913 میں یونگ کو ایک خط لکھ کر یہ واضح کردیا کہ اس کے ذاتی تعلقات اب ختم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دونوں کے رشتے ٹوٹ گئے اور خط و کتابت بھی بند ہوگئی۔ اس کے بعد یونگ نے کبھی فرائڈ سے ملاقات نہیں کی اور اپنا الگ مکتب فکر قائم کیا جس کو وہ Analytical Psychology کہتا تھا۔

کارل یونگ اپنے خوابوں کے عجیب و غریب مواد سے خود پریشان رہتا تھا اور وہ ان خوابوں کا تجزیہ نہیں کرسکتا تھا۔ ایک دن اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک خطرناک سیلاب نے پورے یورپ میں تباہی مچا دی ہے اور اس کے اپنے وطن کے پہاڑ اس سیلاب میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس سیلاب کا پانی خون میں تبدیل ہوگیا ہے۔ اس نے ہزاروں لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھا تھا، اور پھر اس قسم کے خواب ہفتوں تک اس کی نیند حرام کرتے رہے کیونکہ وہ ہر بار خون کی ندیاں بہتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ وہ خود کہتا تھا کہ اس قسم کے خوابوں نے مجھے نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔

اسی سال اگست میں پہلی جنگ عظیم کی ابتدا ہوگئی اور پھر جو اس نے دیکھا اور سنا تو وہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ کیا واقعی اس کی اپنی ذات اور پوری انسانیت میں کوئی رابطہ ہے، کوئی واسطہ ہے جس کی توضیح نہیں کی جاسکتی تھی اور یونگ خود اعتراف کرتا ہے کہ اس دن سے 1928 تک وہ اپنی ذات کی تلاش میں بھٹکتا رہا اور تقریباً 15 سال تک اپنی ذات کی گہرائی میں ڈوب ڈوب کر نکلتا رہا اور اس کی یہ کوشش آگے چل کر اس کے کئی نظریات کی بنیاد بنی۔

یونگ کے نظریات اور فلسفے کے بارے میں ہال اور لنڈزی (C.S. Hall and Lindzey) نے اپنی کتاب Theories of personalities میں لکھا تھا "یونگ کے نظریے کے مطابق مکمل ذات یا نفس مختلف لیکن ہم عمل عناصر پر مشتمل ہوتی ہے جو ایک باہمی نظام کے تحت مل کر ذات کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ عناصر یا اصول ہیں۔ انا، ذاتی لاشعور (personal uncouncious) اور اس کے الجھاؤ، اجتماعی لاشعور (Collective Unconcious) اور اس کے آثار اولی، شخصیت ظاہری (persona)، روح حیوانی (Anima/Animus) اور ہمزاد (Shadow)۔ یہ تمام عوامل ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں ساتھ ہی فرد کا طرز فکر، مشاہدۂ باطن اور بیرون بینی کا میلان طبع، فکر، احساس، حسیت اور بصیرت کے باہمی اشتراک سے ایک ذات تشکیل پاتی ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہوتی ہے۔

فرائڈ نے شخصیت کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا یعنی اڈ، انا اور فوق الانا۔ اسی طرح یونگ نے بھی اس کو تین حصوں میں ہی بانٹا ہے لیکن ان کے نام بدل دیے ہیں۔ پہلے حصے کو وہ Ego کہتا ہے، اس کا مفہوم اس کی نظر میں وہی ہے جو شعور کا ہوسکتا ہے، دوسرے حصے کا نام اس نے ذاتی لاشعور یا شخصی لاشعور رکھا۔ اس سے اس کا مطلب ذہن کے اس مواد سے تھا جس کا فرد کو (اس وقت) شعور نہ ہو لیکن جو مستقبل میں ضرورت پڑنے پر شعور میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح یہ مفہوم فرائڈ کے مفروضے تحت الشعور کے مطابق ہی ہے اور یونگ نے اس کا نام بدل کر ذاتی لاشعور رکھ دیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ فرد کے ان تجربات کے ساتھ ساتھ ان خیالات کو بھی شامل کرتا تھا جو کسی سبب ذاتی لاشعور میں دھکیل دیے گئے ہوں یعنی دبا (Supress) کردیے

گئے ہوں لیکن ان میں فرد کی جبلی خصوصیات کو کوئی دخل نہیں تھا۔ یونگ کے نظریۂ ذات کا جو سب سے اہم حصہ تھا اسے یونگ نے اجتماعی لاشعور کا نام دیا۔ اس سے اس کا مطلب اس لاشعوری مواد سے تھا جو فرد پیدائش کے وقت اپنے ساتھ لے کر آتا ہے اور اس میں وہ خصوصیات، تجربات اور احساسات شامل ہوتے ہیں جو فرد کو اپنے آباو اجداد سے ورثے میں ملتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ اجتماعی لاشعور انسان کے ذاتی تجربات اور واقعات سے بالکل لاتعلق ہوتا ہے اس لیے اس کا مواد شعور میں نہیں آتا لیکن ہمارے ہر تجربے، کردار اور ہر رویے پر اس کے اثرات صاف نظر آتے ہیں اور فرد کو اس مواد کی معلومات دوسرے افراد کے کردار اور رویوں سے ہوتی ہے۔ اجتماعی لاشعور عالمگیر ہوتا ہے اور تمام انسانوں میں ایک جیسا ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں انسان کے ذہن میں ذاتی لاشعور کا جو خطہ ہوتا ہے اس کے پرے اجتماعی لاشعور کا خطہ آجاتا ہے جس میں بہت گہرائی ہے اور بہت اندھیرا ہے اور وہاں کسی شے کو تلاش کرلینا اور پالینا ناممکن ہے۔

اپنے اس نظریے کی دلیل میں یونگ نے کہا تھا کہ پہلی ہی نظر میں کسی کی جانب ایک کشش محسوس کرنا یا کسی اجنبی جگہ پر جاکر یہ محسوس کرنا کہ ہم یہاں پہلے بھی آچکے ہیں یا بعض ایسی نشانیوں کو پہچان لینا جو ماضی بعید سے تعلق رکھتی ہوں۔ یہ ایسی خصوصیات ہیں جو افراد کو ان کے آباواجداد اور مشترکہ تہذیب کے ذریعے ان کے لاشعور میں آگئی ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ہزاروں سال پہلے جب دنیا کے مختلف خطوں میں کوئی آمدورفت یا رسل و رسائل کے ذرائع نہیں تھے اور مختلف تہذیبوں میں آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا اس وقت بھی دنیا کے مختلف علاقوں کی تہذیب وتمدن میں یکسانیت پائی جاتی تھی اور وہی نقوش آج بھی نمایاں ہیں۔

یونگ نے اپنے اسی نظریے کو بنیاد بنا کر Archetype کا تصور پیش کیا (اس کے لیے راقم الحروف نے آثار اولی کی اصطلاح استعمال کی ہے) یہ اجتماعی لاشعور کے اجزا ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ آثار اولی کی وجہ سے ہی انسان ایک خاص انداز میں ادراک کی صلاحیت رکھتا ہے، خاص انداز میں سوچتا ہے اور خاص انداز میں ہی عمل کرتا ہے اور ان سب کا دارومدار ہمارے قدما کے تجربات پر ہے۔ اس کا خیال تھا کہ آثار اولی ایک کائناتی مظہر ہے۔ کیونکہ اس کے تجربات بھی کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس وسیع و عریض دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے افراد کا فنون لطیفہ کی جانب ایک جیسا رجحان، دنیا کے تمام مذاہب کے عارفانہ اور پراسرار عناصر کا ایک ہی ساتھ مختلف مقامات پر ظہور ہونا، جن بھوت اور پریوں کے بارے میں دنیا بھر میں ایک ہی خیال ہونا اس نظریے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ یونگ نے ایک عجیب سی مثال بھی دی ہے جس کا آج کل دنیا میں چرچا ہے کہ انسان کو اپنی موت سے قبل کچھ اشارے ملنے لگتے ہیں اور یہ اشارے دنیا کے مختلف مذاہب اور فرقوں سے تعلق رکھنے والے، الگ الگ تہذیب وتمدن میں پرورش پانے والے سب کے لیے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جو لوگ موت کے قریب ہوتے ہیں وہ ایک جیسے خواب دیکھتے ہیں، وہ خوابوں میں اپنے گزرے ہوئے رشتے داروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ انھیں بلا رہے ہیں، یا وہ خواب میں دیکھتے ہیں کہ وہ ایک اندھیری سرنگ میں جارہے ہیں اور پریشان حال ہیں کہ ان کو سرنگ کے دوسرے کنارے پر ایک روشنی نظر آتی ہے۔ وہ مرحوم رشتے داروں کو اسی لباس میں دیکھتے ہیں جس لباس میں اس کی آخری رسومات ادا کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ پوری دنیا میں پیدائش، موت، ماں، باپ، بچہ اور خالق مطلق کے لیے یکساں تصورات پائے جاتے ہیں۔

اجتماعی لاشعور کے اجزا آثار اولی کی شکل میں نمایاں ہوتے ہیں اور اس کے خیال میں آثار اولی کی بہت سی اقسام طے کی جاسکتی ہیں اور ان کا تعین انسان اپنی ضرورت اور اپنے تجربے کی بنیاد پر کرسکتا ہے۔ ایک Archetype ایسی خصوصیت ہے جس کے بارے میں ہمیں زیادہ علم نہیں لیکن پھر بھی اس کی وجہ سے ہم مختلف اشیا کا تجربہ ان کی مخصوص حالت میں کرتے ہیں۔ اس کی کوئی طے شدہ شکل بھی نہیں ہے لیکن اس کا عمل منظم اصول کے تحت ہوتا ہے۔ فرائڈ کے ہاں اسی خیال سے ملتی ہوئی خصوصیت جبلت کہلاتی ہے۔ اس نے جن Archetype کا ذکر کیا ہے ان میں سے کچھ خاص مندرجۂ ذیل ہیں:

Mother Archetype: اس کے لیے وہ کہتا ہے کہ ماں کے بارے میں دنیا بھر میں ایک ہی تصور پایا جاتا ہے۔ یہ تصور انسانوں میں ہی نہیں بلکہ حیوانات میں انسان سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ ایک ایسی ہستی جو اپنے بچے کے لیے ضروری ہے۔ ہم بغیر مادرانہ احساس کے ایک بچے کی پرورش کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ یونگ کا کہنا تھا کہ ہم دنیا میں آئے تو ماں کی ضرورت کو ساتھ لائے اور ساتھ ہی لائے اس سے رشتے کا ایک احساس جس کی وجہ سے ہم اسے ماں کہتے ہیں ایک بچہ اس وقت بھی اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے جب اس کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ اس ہستی کے جسم کا ایک حصہ ہے اور اس کی وجہ سے ہی اسے یہ زندگی ملی ہے۔

اس کے بعد وہ Mana کا ذکر کرتا ہے۔ اس سے اس کا مطلب اس پراسرار توانائی سے تھا جو ہر شے میں موجود ہوتی ہے اور ہزاروں سال سے اس کو تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ یونگ کے کچھ ہم عصر مفکرین کا خیال تھا کہ یونگ کے لیے منا کا تصور وہی ہے جو ہندو مذہب میں شیولنگ کا ہے۔ وہ اس کو روحانی

طاقت تصور کرتا ہے کیونکہ اس نے قدیم زبانوں کا مطالعہ کیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ کسی زمانے میں ایک ایسی ہی شے کی پرستش کی جاتی تھی جو مردانہ عضو سے مماثلت رکھتی تھی لیکن اس زمانے میں اس شے کا تعلق قطعی طور پر جنس سے نہیں تھا بلکہ اس کو خالق مطلق کی حیثیت دی جاتی تھی اور اس کو زندگی دینے والا تصور کیا جاتا تھا۔ اس شے کی پرستش خاص موقعوں پر خاص مقاصد کے لیے کی جاتی تھی۔ جیسے اچھی فصل کے لیے، مچھلیوں کی اچھی پیداوار کے لیے، اگر علاقہ پر کوئی آفت آگئی ہے تو اس سے حفاظت کے لیے یا کسی لاعلاج مرض سے چھٹکارا پانے کے لیے۔ اس شے کی پرستش انفرادی طور پر نہیں بلکہ اجتماعی طور پر ہی کی جاتی تھی۔

وہ ایک اور Archetype کا ذکر کرتا ہے اور اس کو وہ Persona کہتا ہے جسے ہم اردو میں ظاہری شخصیت کہہ سکتے ہیں۔ Persona کے معنی ایک نقاب سے لیے جاتے ہیں جو کسی ڈرامے کے مختلف کردار استعمال کرتے ہیں۔ اس سے اس کا مطلب فرد کی شخصیت کے اس پہلو سے تھا جو معاشرے میں اس کی پہچان بن جاتا ہے اور لوگ اس کو اس کی کچھ مخصوص خصوصیات کی وجہ سے جانتے ہیں۔ یعنی کوئی فرد حقیقت میں کچھ بھی ہو لیکن معاشرے میں وہ جو نقاب پہنے ہوئے ہے وہی اس کی پہچان ہے اور وہی چہرہ جو لگائے ہوئے ہے اس کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔

اسی سلسلے کا ایک اور نظریہ اہمیت رکھتا ہے جس کو وہ Anima کہتا ہے۔ اس کو یہ نظریہ اس کے خوابوں سے ملا۔ وہ اکثر خوابوں میں ایک ایسی بزرگ ہستی کو دیکھا کرتا تھا جس کے بارے میں اس کے ذہن میں عقیدت کا احساس ہوتا تھا۔ وہ ان کو ایک بزرگ، ایک مقدس ہستی اور دانشور کا نام دیتا تھا۔ یونگ اس ہستی کے ساتھ اکثر ایک چھوٹی سی لڑکی کو بھی دیکھتا تھا جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی۔ اس مظہر سے اس نے Anima کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریے کے تحت اس کا خیال تھا کہ ہر مرد کے ساتھ ایک مونث روح ہوتی ہے جس کو وہ Anima کہتا ہے اور ہر عورت کے ساتھ ایک مذکر روح ہوتی ہے اور اس کو اس نے Animus کا نام دیا۔ وہ کہتا ہے کہ ان دونوں قسم کی روحوں کی وجہ سے مرد اور عورت میں ایک ابدی کشش پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے یہی دونوں متضاد توانائیاں اجتماعی لاشعور میں پوشیدہ ہیں۔ یونگ اس نظریے کو اس حقیقت سے جوڑ کر دیکھتا ہے کہ کچھ مردوں میں عورتوں کی طرح لباس پہنے اور ان کی طرح میک اپ کرنے کا رجحان ہوتا ہے۔ دوسری طرف کچھ عورتیں مردانہ کپڑے پہن کر خوش ہوتی ہیں وہ سگریٹ پیتی ہیں، گھوڑ سواری کرتی ہیں، بالوں کو مردانہ طرز پر رکھتی ہیں۔ ان میں مذکر روح زیادہ توانا ہوتی ہے۔ یونگ کے ایک ہم عصر ماہر نفسیات نے یونگ کے اس نظریے کی حمایت میں یہ لکھا تھا کچھ لوگ اپنی مخالف جنس کی طرح کھلے عام رہتے ہیں جب کہ تحلیل نفسی کے دوران یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ بہت سے مرد خلوت میں عورتوں کی طرح لباس پہن کر اور زنانہ میک اپ کرکے اپنی اس اندرونی خواہش کی تسکین کرلیتے ہیں۔

ایک اور Archetype کو وہ Shadow کہتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ماضی کا سایہ ہمیشہ فرد کے ساتھ رہتا ہے اور یہ سایہ کبھی کبھی اس کو حیوانیت کے دروازے پر لاکر کھڑا کر دیتا ہے جہاں وہ ضابطۂ اخلاق کو فراموش کر کے جو کردار ادا کرتا ہے وہ جانوروں کی طرح عمل کرنے سے وجود میں آتا ہے اور ایسے کردار کو نہ ہم اچھا کہہ سکتے ہیں نہ برا۔ یونگ کا خیال تھا کہ چونکہ حیوانیت کا احساس بذات خود ایک غیر انسانی احساس ہے اس لیے حیوانیت کا یہ سایہ ہماری ذات کا ایک تاریک پہلو ہے۔

یونگ کے ہاں ذات کا تصور کچھ مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہماری ذات میں ہی ہماری تخلیق کا راز پوشیدہ ہے اور یہ ذات ہی ہے جو دنیا کی مختلف توانائیوں کا مرکز ہے۔ اس کے خیال میں ذات کی گہرائیوں میں جاکر ہی اس مرکز تک پہنچنا ممکن ہے اور جس نے اس گہرائی میں جاکر ذات کی حقیقت کو پہچان لیا وہ عرفانیت کی بلندی کو پہنچ گیا۔ یونگ نے ایک نقش تیار کیا تھا جس کو وہ منڈالا Mandala کہتا تھا۔ یہ ڈرائنگ کچھ جیومیٹری کی اشکال اور کچھ پیچیدہ سی شکلوں پر مشتمل تھی لیکن اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس نقش کے درمیان میں ایک مرکزہ تھا۔ انسان جب مراقبہ کے دوران اس منڈالا نقش کو سامنے رکھ کر دھیان لگائے تو یہ ڈرائنگ اس کی توجہ کو اس کے مرکز پر مرکوز رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

یونگ کے نظریات کے بارے میں اس کے معاصرین کا خیال تھا کہ اگر تجرباتی نفسیات کے تحت ان کا مطالعہ کیا جائے تو یہ نظریات سائنٹفک نہیں کہے جاسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نظریات علمی نفسیات کا ایک حصہ نہیں بن سکے اور ان کا ذکر آج بھی کارل یونگ کے تذکرے کے تحت کیا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے ان کی یہ بات صحیح ہو لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کارل یونگ کی خدمات نفسیات میں آج بھی اتنی ہی اہم تسلیم کی جاتی ہیں جتنی ابتدائی دور میں تسلیم کی جاتی تھی۔ کارل یونگ فرائڈ کی موت کے بعد 22 سال تک زندہ رہا اور حالانکہ اس نے اپنا الگ مکتب فکر قائم کرلیا تھا لیکن فرائڈ کی مخالفت میں کبھی کچھ نہیں کہا۔ اس کے معاصرین کا یہ بھی خیال ہے کہ اس کے ہاں مذہبی رجحانات تو ملتے ہیں لیکن وہ خود عیسائیت سے کلی طور پر متاثر نہیں تھا۔ اس کی نظر میں دو ہستیاں ایسی تھیں جو عرفانیت کی بلندیوں تک پہنچ چکی تھیں، ایک حضرت عیسیٰ اور دوسری مہاتما بدھ۔ یونگ کو ان دونوں مذہبی

رہنماؤں سے بہت عقیدت تھی اور ان کے بارے میں اس نے لکھا تھا کہ دونوں ہی اپنی ذات کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس کی حقیقت کو پہچان گئے تھے۔ ان کے خیال میں ہندو ازم میں ذات کا تصور ایسا ہے جیسے کسی بحر اعظم میں چھوٹے چھوٹے جزائر اور سب کے نیچے ایک ہی سمندر ہے جو سب کی اصل کو ملائے ہوئے ہے۔ یونگ کی تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہندو ازم سے اثرات قبول کیے تھے۔ اس نے سنسکرت سیکھی اور ہندوازم اور بدھ ازم کا مطالعہ کیا۔ اس نے بیرونی دنیا کو مایا (Maya) کہا ہے۔ اس کے مطابق مایا خدا کا ایک خواب ہے یا ایک التباس کی شکل ہے۔ روح کے بارے میں اس کا فلسفہ ہندوازم سے متاثر تھا۔ اس نے انفرادی روح کے لیے Jivatman کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس نے Atman کا لفظ بھی استعمال کیا ہے اور اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہم سب خالق مطلق کا ایک حصہ ہیں، ہم اس کی قدرت کے ذرات کی حیثیت رکھتے ہیں جو اپنی حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں اور اپنے آپ کو اس سے الگ تصور کرتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم کبھی بھی اپنی اصل سے الگ نہیں ہوتے۔ موت کے بعد جب آنکھ کھلتی ہے تو حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہم کون تھے اور ہماری اصل کیا تھی یعنی وہی جس کو ہم خدا کہتے ہیں۔ اسی طرح مراقبہ کے بارے میں اس کا نظریہ ہندوازم سے متاثر تھا۔ اس کے مطابق جب ہم اپنے اردگرد کی دنیا کو بھول کر اپنی توجہ ایک مرکز پر کر دیتے ہیں تو اپنے لاشعور میں سکڑ جاتے ہیں اور اس طرح ہم اپنی ذات سے قریب تر ہو جاتے ہیں اور اگر گہرائی میں جائیں تو اس مقام پر پہنچ سکتے ہیں جہاں ہمارا لاشعور اجتماعی لاشعور (Collective unconscious) کا ایک حصہ بن کر دوسرے افراد کے ذاتی لاشعور کے ساتھ رابطہ قائم کرسکتا ہے اور ان سے مکالمہ کرسکتا ہے۔

609, A.K. Tower, Madina Manzil Complex,
S.V. Road, Goregaon, Mumbai-62

* * *

انیس کے سلام

مرتبہ: علی جواد زیدی

انیس کے سلاموں کا یہ پہلا جامع مجموعہ ہے جس میں انیس کے تمام مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ سلام شامل ہیں۔ اسی کے ساتھ انیس کے نوحے، ایک مناجات، ایک منقبتی مخمس اور کچھ تضمینیں بھی شامل ہیں۔ سلاموں کی تعداد 102 ہے جن میں تحت اللفظ 44 اور سوز کے 58 سلام ہیں۔ انیس کے سلاموں کا یہ مجموعہ سید علی جواد زیدی نے مرتب کیا ہے۔ مقدمے میں انھوں نے نہ صرف اردو میں رثائی شاعری کی پوری تاریخ بیان کردی ہے بلکہ ہر دور میں اس صنف شاعری کے قابل لحاظ نمونوں کی خصوصیات بھی واضح کی ہیں۔

صفحات: 307، قیمت: -/60 روپے

انشا کا ترکی روزنامچہ

مصنف: انشاء اللہ خاں انشا

انشاء اللہ خاں انشا اپنے زمانے کے مستند شاعر اور کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ یہ روزنامچہ جو سعادت علی خاں کے دربار سے ان کی وابستگی کے دنوں کی یادگار ہے، ترکی زبان کے اس لہجے میں لکھا گیا ہے جو ''چغتائیہ'' کے نام سے موسوم ہے۔ ڈاکٹر نعیم الدین نے یہ ترجمہ براہ راست ترکی زبان سے کیا ہے اور مقدمے میں اس کی لسانی خصوصیات اور اس کے مندرجات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

صفحات: 68، قیمت -/4.50 روپے

اردو کی نثری داستانیں

مصنف: گیان چند جین

اردو میں جو نثری داستانیں قلمبند کی گئی ہیں، ان کی تعداد سیکڑوں سے تجاوز کر جاتی ہے۔ پروفیسر گیان چند جین کی یہ کتاب تمام دستیاب نثری داستانوں کا تعارف بھی ہے اور ان پر تنقیدی محاکمہ بھی۔ مختلف داستانوں کے فنی مدارج اور اس فن کے عہد بہ عہد ارتقا پر بھی عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

صفحات: 906، قیمت: -/276 روپے

اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب

مصنف: گوپی چند نارنگ

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ادبی اور علمی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہے۔ لسانیات، اسلوبیات، اساطیر، کتھا کہانی، فکشن، ادبی تھیوری، مابعد جدیدیت اور ادب شناسی میں مقامیت کے مباحث ہوں یا اردو کے پرانے اور نئے، نثر اور نظم کے نمائندہ فن کاروں کے انفرادی کارناموں کی قدر شناسی، نارنگ صاحب کے کاموں کی اہمیت مسلم ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ہندوستانی ذہن و تہذیب کے ان سرچشموں کی نشاندہی کی ہے جن کی آبیاری سے اردو غزل سرسبز ہوئی۔

صفحات: 463، قیمت: -/250 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

کونسل کی بعض اہم کتابوں پر غیر معمولی رعایت

2005 کا سال اردو ادب میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار پریم چند کی 125 ویں سالگرہ کا سال ہے۔ بیسویں صدی میں برصغیر کے سب سے بڑے شاعر اقبال کے کلام کی باقاعدہ اشاعت بھی 1905 سے شمار کی جاتی ہے اور اس سال ان کی شاعری میں ایک نیا موڑ بھی آیا۔ اردو کے کلاسیکی شعرا میں آخری بڑا نام نواب مرزا خاں داغ دہلوی کا ہے۔ 2005 میں ان کے انتقال کو بھی سو سال ہو جائیں گے۔ 2005 اس لیے بھی اہم ہے کہ ہمارے ترقی پسند ادب کے اہم ترین معمار سجاد ظہیر کی پیدائش کو بھی 2005 میں سو سال ہو جائیں گے۔ مشہور ترقی پسند افسانہ نگار اور مارکسی مفکر ڈاکٹر رشید جہاں کی پیدائش کے بھی سو سال اسی سال مکمل ہوں گے۔

سال 2005 کی مندرجۂ بالا اہمیت کے پیش نظر یہ طے کیا گیا ہے کہ کونسل کی مندرجۂ ذیل اہم مطبوعات کو ہم 75%فیصد رعایت پر شائقین کو فراہم کریں گے یعنی جو کتاب 100 روپے کی ہے وہ 25 روپے میں حاصل ہو سکے گی۔ **یہ خصوصی رعایت 31 دسمبر 2005 تک ہے۔** محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمے ہوگا۔ برائے کرم کتابوں کی قیمت پیشگی روانہ فرمائیں۔

جو کتابیں کئی جلدوں میں ہیں ان کی کوئی جلد الگ سے فروخت نہ کی جا سکے گی۔ لیکن ہم پریم چند کی 125 ویں سالگرہ کے موقعے پر کلیات پریم چند کی متفرق جلدیں اس موقعے پر بے تکلف مہیا کر سکیں گے۔ کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے۔

جامع انگریزی اردو لغت

مرتب: کلیم الدین احمد

محققین، مترجمین، دفتری اہل کاروں، اساتذہ، قانون دانوں، اہل علم و قلم، صحافیوں، طلبہ اور عام لوگوں کی روزمرہ ضروریات کے لیے یکساں افادیت کی حامل یہ انگریزی اردو لغت ڈھائی لاکھ سے زائد الفاظ و اصطلاحات و معانی کا احاطہ کرتی ہے۔ مترادفات، محاورات اور تشریحات سے مزین اپنی نوعیت کی یہ پہلی مستند، وقیع اور ضخیم لغت ویبسٹر کو بنیاد بنا کر تیار کی گئی ہے۔

قیمت: مکمل سیٹ -/3400 روپے

فرہنگِ آصفیہ

مرتب: سید احمد دہلوی

یہ اردو زبان کا وہ مشہور اور مستند لغت ہے جو برسوں سے نایاب تھا۔ اس لغت میں عربی، فارسی، ترکی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی کے وہ تمام الفاظ شامل ہیں جو اردو زبان کا جزو بن چکے ہیں۔

قیمت: (مکمل تین جلدیں) 750 روپے

نور اللغات

مرتب: نور الحسن نیر کاکوروی

یہ مولوی نور الحسن نیر کاکوروی کی تالیف کردہ اردو کی مشہور اور مستند لغت ہے جو چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ اہم لغت مدت سے نایاب تھی، اردو کونسل نے عام استفادے کے لیے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔

قیمت: (مکمل سیٹ) -/1095 روپے

جامع اردو انسائیکلوپیڈیا

کونسل نے اردو میں پہلا مکمل اور بین الاقوامی معیار کا انسائیکلوپیڈیا شائع کیا ہے۔ اس کا سارا مواد بڑی دیدہ ریزی اور مشقت کے ساتھ سلیس زبان اور دلنشیں پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایسی کاوش ہے جو آئندہ کئی نسلوں کو علم و دانش سے مالا مال کرتی رہے گی۔ ادیبوں، صحافیوں، طلبہ اور علم دوست قارئین کے لیے ایک نادر تحفہ، ہر جلد اپنے آپ میں مکمل ہے۔

مکمل آٹھ جلدوں پر مشتمل، سات جلدیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

قیمت: -/1790 روپے

کلیات پریم چند

مرتب: مدن گوپال

معاون: ڈاکٹر رشیل صدیقی

اردو فکشن کے بنیادگزاروں میں منشی پریم چند کا نام سرفہرست ہے جنھوں نے ناول اور مختصر افسانے کی اصناف کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ انھیں وقار اور اعتبار بھی بخشا۔ منشی پریم چند کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز اردو سے ہوا تھا، پھر وہ ہندی میں بھی لکھنے لگے اور وہاں بھی اپنے عہد کی سب سے بڑی ادبی شخصیت کہلائے۔ کونسل نے پریم چند کی تمام تحریریں اس کلیات میں مجتمع کر دی ہیں جو 24 جلدوں پر مشتمل ہے۔

قیمت: (مکمل سیٹ) 4071/- روپے

اڑیسہ میں اردو

حفیظ اللہ نیولپوری

ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری کی یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اڑیسہ میں اردو کا تاریخی اور ثقافتی پس منظر بیان کیا گیا ہے، دوسرا باب اڑیسہ میں اردو شاعری کے ارتقا اور تیسرا اردو نثر کے ارتقا کے بیان میں ہے۔ چوتھا باب دو فصلوں میں منقسم ہے اڑیسہ کا اردو اسٹیج اور اردو ڈرامے اور اڑیسہ میں اردو صحافت۔ باب پنجم چار ذیلی عنوانات پر مبنی ہے اڑیسہ میں عہد جدید میں اردو، اردو تعلیم کی صورت حال، اردو کے ادبی اور ثقافتی ادارے، اردو کی اشاعتی سرگرمیاں۔ چھٹا باب حاصل مطالعہ، کے عنوان سے ہے جس میں تمام مباحث کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے — اپنے موضوع پر ایک جامع اور مستند کتاب۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 504، قیمت: 157/- روپے

سیر کہسار

پنڈت رتن ناتھ سرشار

اردو کے مایۂ ناز انشا پرداز اور ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار کا مشہور ناول جو مدتوں سے نایاب تھا۔

صفحات: 845، قیمت: 167/- روپے

اصول معاشیات

سید علی

یہ کتاب اعلیٰ ثانوی درجات کے طلبہ کو معاشیات کے بنیادی اصولوں سے واقف کرانے کی غرض سے لکھی گئی ہے۔

صفحات: 192، قیمت: 47/- روپے

تاریخ ادب اردو

مرتبہ: سیدہ جعفر، گیان چند جین

پانچ جلدوں پر مشتمل اس ضخیم کتاب میں اردو ادب کے عہد اولین کے تمام مہیا مواد کا تحقیق شدہ نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔ اردو ادب کی مختلف تاریخوں میں یہ تاریخ اپنی خصوصیات کے باوصف منفرد اہمیت کی حامل ہے۔

قیمت: فی جلد 170 روپے، مکمل سیٹ: 850 روپے

للو لال جی کوی — ایک ادبی سوانح

ابو سعادت جلیلی

فورٹ ولیم کالج سے وابستہ قلم کاروں میں للو لال جی اہم مقام کے حامل ہیں۔ انھوں نے جدید ہندی نثر کی بنیاد ڈالی۔ اس کتاب میں ان کے احوال و کوائف کے ساتھ ساتھ ان کے معاصرین کا بھی مختصر طور پر تعارف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 280، قیمت: 72/- روپے

تامل ناڈو میں اردو

علیم صبا نویدی

اس کتاب میں 1824 سے 1986 کے درمیان تامل ناڈو کے اردو شعر و ادب سے متعلق واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے اور تذکرے کے انداز میں تمام شعرا و ادبا کے حالات اور کلام کے نمونے درج کیے گئے ہیں۔

صفحات: 436، قیمت: 135/- روپے

جنت سنگار

ملک خوشنود، مرتبہ: پروفیسر سیدہ جعفر

ملک خوشنود کی مثنوی ''جنت سنگار'' (1645) دکنی ادب کے قدیم شہ پاروں میں سے ہے۔ کونسل نے اسے پروفیسر سیدہ جعفر کے مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔

صفحات: 590، قیمت: 180/- روپے

زراعتی انکشافات

پروفیسر محمد شفیع

اس کتاب میں زراعت سے متعلق مختلف موضوعات مثلاً زراعتی مٹی، کھاد، فصلوں کی عام بیماریوں، فصلوں پر کیڑوں کے حملے اور ان کا انسداد، ریشم اور شہد کی پیداوار، لاکھ اور جل کھمبی (Mushroom) کی کاشت اور مچھلی پالن وغیرہ موضوعات پر آسان زبان میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 260، قیمت: 192/- روپے

غرائب الجمل

شمس العلما نواب عزیز جنگ ولا

نظرثانی وترتیب: حسن الدین احمد

اس کتاب میں تاریخ گوئی کے اصولوں اور قاعدوں کو مفصل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان تاریخی قطعات کو بھی محفوظ کر دیا گیا ہے جو اب آہستہ آہستہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔

صفحات: 314، قیمت: 76/- روپے

ہندوستانی مصوری (عہدِ مغلیہ میں)

پرسی براؤن، مترجم: عبدالحق

مغلیہ عہد میں جہاں تمام فنون لطیفہ کو عروج حاصل ہوا وہیں فنِ مصوری میں نہ صرف بڑی ترقی ہوئی بلکہ اس فن کے نئے نئے پہلوؤں کا ارتقا ہوا۔ مغل مصوری صرف تصویرچہ (miniature) سازی نہیں، صرف کتابوں پر نقاشی نہیں، بہت کچھ اور بھی ہے اور یہ مصوری دنیا کے فنون لطیفہ کی تاریخ کا زریں باب ہے۔ اس کتاب میں مصوری کی تاریخ کے ساتھ ساتھ مصوری کی اقسام، طریقہ کار، ساز و سامان، اہم مصوروں اور ان کے فنی نمونوں کی فہرست بھی درج کی گئی ہے۔

صفحات: 256، قیمت: 158/- روپے

بھارت 2001

یہ کتاب اردو زبان میں بھارت کے بارے میں معتبر اور مفید معلومات کا خزانہ ہے۔ مرکزی اور صوبائی ملازمتوں کے مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے والے طلبہ کے لیے یہ کتاب خصوصی اہمیت اور افادیت کی حامل ہے۔

صفحات: 949، قیمت: 250/- روپے

فیودر دستوئیفسکی

ظ. انصاری

عظیم روسی ناول نگار فیودر دستوئیفسکی کا شمار دنیا کے بڑے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب دستوئیفسکی کی حیات اور اس کے کارناموں سے پوری طرح واقف کراتی ہے۔

صفحات: 184، قیمت: 52/- روپے

ہندوستانی مصوری — ایک خاکہ

انیس فاروقی

ہندوستان میں مصوری کی ایک وقیع روایت رہی ہے۔ تین حصوں میں منقسم اس کتاب میں ہندوستانی مصوری کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ مشہور مصور اور مصنف ڈاکٹر انیس فاروقی نے آسان زبان میں ایک مشکل موضوع کا تعارف پیش کیا ہے۔

صفحات: 188، قیمت: 130/- روپے

لغات ابجد شماری

سید احمد

اس کتاب کے پہلے حصے میں حساب ابجد کے مطابق حروف تہجی کی ترتیب سے دیے گئے الفاظ کے اعداد درج کیے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں اعداد کے تحت ترتیب وار الفاظ دیے گئے ہیں۔ فن تاریخ گوئی سے شغف رکھنے والے حضرات کے لیے ایک انمول تحفہ۔

قیمت: مکمل سیٹ (چار جلدیں) 472/- روپے

گلشن بے خار

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، مترجم: حمیدہ خاتون

اس مشہور تذکرے میں کلاسیکی اردو شاعروں خاص کر دلی کے شاعروں کے منتخب اشعار، ان کے مختصر حالات اور کلام پر شیفتہ نے فارسی میں تبصرہ اور تذکرہ تحریر کیا ہے۔ شیفتہ کی تنقیدی رائیں اردو تنقید اور شعر شناسی میں بے حد اہم مانی جاتی ہیں۔ حمیدہ خاتون نے سلیس اردو زبان میں اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

صفحات: 430، قیمت: 128/- روپے

حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات

سید ممتاز مہدی

حیدرآباد اردو ادب وصحافت کا ایک اہم مرکز ہے۔ اس تحقیقی کتاب میں حیدرآباد سے شائع ہونے والے اخبارات کی ادبی خدمات کے ساتھ وہاں کی صحافتی تاریخ بھی پیش کی گئی ہے۔

صفحات: 428، قیمت: 92/- روپے

وضاحتی کتابیات (22 جلدوں میں)

مرتبین (جلد اول تا سوم): گوپی چند نارنگ، مظفر حنفی

مرتب: (جلد چہارم تا بائیس): مظفر حنفی

وضاحتی کتابیات میں بیسویں صدی کے ربع آخر میں شائع ہونے والی تقریباً تمام اردو کتابوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ہر کتاب کا مختصر تعارف، مصنف، ناشر، سائز، صفحات اور قیمت وغیرہ بھی دی گئی ہے۔

قیمت (اکیس جلدیں): 2489/- روپے

مسدود راہیں

ترجمہ اور تعارف: زاہدہ زیدی

یہ کتاب دنیا کے عظیم ترین جدید ڈراما نگاروں یوجن لونیسکو (Eugene Lonesco)، میگوئل دی پیرانڈیلو (Miguel de Pirandello)، ژاں پال سارتر (Jean Paul Sartre)، سیمول بیکٹ (Samuel Beckett) کے منتخب ڈراموں پر مشتمل ہے۔ ہر ڈرامے سے قبل زاہدہ زیدی نے ڈراما اور ڈراما نگار کا جامع تعارف تحریر کیا ہے۔ سب تراجم براہ راست اصل زبان سے کیے گئے ہیں۔

صفحات: 406، قیمت: 128/- روپے

انتظامی قانون کے اصول

ایم. پی. جین، ایس. پی. جین، مترجم: احمد مرزا

ہندوستان میں انتظامی قانون کے اصول اور مبادیات سے یہ کتاب تفصیلی طور پر متعارف کرتی ہے۔ انتظامی قانون ایک جدید صنف قانون ہے اور اس کے مسائل و نظریات ابھی عالم ارتقا میں ہیں۔ یہ کتاب تمام مسائل کا عمدہ بیان پیش کرتی ہے۔

صفحات: 612، قیمت: -/120 روپے

ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا

ایچ. این. سنہا، مترجم: محمد سلیم قدوائی

اس کتاب میں ہندوستانی تاریخ کی ابتدا سے عصر حاضر تک کے سیاسی اداروں، نظریوں اور روایتوں کا تنقیدی اور تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔

صفحات: 377، قیمت: -/95 روپے

وجے نگر کے عہد میں نظام حکومت اور سماجی زندگی

کے. اے. نیلکنٹھ شاستری

اس کتاب میں سلطنت وجے نگر کی تین صدیوں (1336-1650) پر مشتمل سیاسی، سماجی، معاشی و تمدنی تاریخ پیش کی گئی ہے۔

صفحات: 569، قیمت: -/118 روپے

چولا راجگان

کے. اے. نیل کنٹھ شاستری، مترجم: ریدمن سیٹھی

اس کتاب میں تمام دستیاب مآخذ کے حوالے سے جنوبی ہند کی چولا سلطنت (850 تا 1216) کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور چولوں کے نظام حکومت، مالیاتی نظام، اس عہد کے معیار زندگی، زراعت اور زمین کے حقوق، صنعت و تجارت، سکے اور ناپ تول کے پیمانے، تعلیم، ادب، آرٹ وغیرہ پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 1115، قیمت: -/209

عشری درجہ بندی

میلول ڈیوی، مترجم: سید محمود حسن قیصر امروہوی

عصر حاضر میں کتابوں کی درجہ بندی کے لیے زیادہ تر کتب خانے ڈیوی کے وضع کردہ عشری درجہ بندی (Dewey Decimal Classification) کو بروئے کار لاتے ہیں۔ اس کتاب میں اس درجہ بندی سے متعلق تمام تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

صفحات: 908، قیمت: -/167 روپے

علی وردی اور اس کا عہد

کالی کنکر دتا، مترجم: عبدالاحد خاں خلیل

مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانے میں جو بہت ساری خودمختار سلطنتیں ہندوستان میں قائم ہوئیں ان میں حکومت بنگال بھی تھی جس کا حکمراں علی وردی خاں تھا۔ علی وردی خاں نے بڑی حد تک ایک مثالی حکومت قائم کی اور اس کے زمانے میں بنگال، بہار اور اڑیسہ میں بہت خوشحالی رہی۔ اس کتاب میں علی وردی خاں کے عہد حکومت (اپریل 1740 تا اپریل 1756) کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 392، قیمت: -/86 روپے

قدیم ہندوستان میں شودر

رام شرن شرما، مترجم: جمال محمد صدیقی

شودر زمانۂ قدیم سے ہی ظلم و استحصال کا شکار رہے ہیں۔ ممتاز مورخ ڈاکٹر رام شرن شرما نے 1000 قبل مسیح سے 500 تک تاریخی تناظر میں ہندوستان میں شودروں کی حالت کا جائزہ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

صفحات: 356، قیمت: -/82 روپے

ہندوستان کا نظامِ جمال

بدھ جمالیات سے جمالیاتِ غالب تک

(تین جلدوں میں)

مصنف: شکیل الرحمٰن

ہندوستان کی تاریخ و تہذیب کے پس منظر میں ہندوستانی فنون لطیفہ کا مطالعہ۔ رنگین تصاویر سے مزین ان جلدوں کی طباعت آرٹ پیپر پر کی گئی ہے۔

کل صفحات: 918، قیمت (مکمل سیٹ): -/1311 روپے

بھارت 2002

یہ کتاب اردو زبان میں بھارت کے بارے میں معتبر اور مفید معلومات کا خزانہ ہے۔ مرکزی اور صوبائی ملازمتوں کے مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے والے طلبہ کے لیے یہ کتاب خصوصی اہمیت اور افادیت کی حامل ہے۔

صفحات: 949، قیمت: -/250 روپے

سید امتیاز الدین

نوبل انعامات 2005

نوبل انعامات کا شمار دنیا کے اہم ترین انعامات میں ہوتا ہے۔ سویڈن کے کروڑ پتی سائنسداں الفریڈ نوبل جس نے ڈائنامائیٹ ایجاد کیا تھا اس نے اپنی تمام پونجی ان انعامات کے لیے وقف کر دی تھی۔ یہ انعامات 1901 سے دیے جا رہے ہیں۔ الفریڈ نوبل کی وصیت کے مطابق یہ انعامات طبعیات (فزکس)، کیمیا (کیمسٹری)، طب (میڈیسن)، ادب اور عالمی امن کے لیے کارہائے نمایاں انجام دینے والی شخصیتوں کو دیے جاتے ہیں۔ 1968 سے سویڈن کی بینک نے معاشیات (اکنامکس) کے لیے بھی انعام دینے کا سلسلہ شروع کیا اور اب اس انعام کو بھی نوبل انعامات کے زمرے میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ ہندوستان کے پروفیسر امرتیہ سین کو یہ انعام مل چکا ہے۔ نوبل انعامات کا اعلان ہر سال اکتوبر میں ہوتا ہے اور یہ انعامات دس دسمبر کو ایک خصوصی تقریب میں دیے جاتے ہیں جسے ساری دنیا میں ٹیلی ویژن پر بھی دکھایا جاتا ہے۔ ہندوستانیوں میں نوبل انعام اب تک رابندر ناتھ ٹیگور، سری وی رمن، مدر ٹریسا اور ہرگوبند کھرانہ نے حاصل کیا ہے۔

2005 کے نوبل انعامات کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ اس سال طبعیات کا نوبل انعام دو امریکی اور ایک جرمن سائنسداں نے مل کر حاصل کیا ہے۔ جرمن سائنسداں تھیوڈور ہینش اور امریکی سائنسدانوں رائے گلابر اور جان ہال کو یہ انعام نور کے متعلق ان کی تحقیق پر دیا گیا ہے۔ ان سائنسدانوں کی تحقیق کے نتیجے میں وقت کی صحیح ترین پیمائش میں مدد ملے گی اور مواصلاتی نظام اور خلائی سفر میں بھی اس تحقیق سے فائدہ ہوگا۔ انعام کی آدھی رقم جو تقریباً ساڑھے چھ لاکھ ڈالر ہوتی ہے، امریکی سائنسداں رائے گلابر کو دی جائے گی جن کی تحقیق اس سلسلے میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ گلابر اس وقت اسی (80) سال کے ہیں اور 1963 سے اس کام میں مصروف ہیں۔ تھیوڈور ہینش (عمر 63 سال) اور جان ہال (عمر 71 سال) نے اس تحقیق میں اور اضافے کیے جن کی وجہ سے نور کی شعاعوں کی فریکونسی کو انتہائی صحت کے ساتھ معلوم کرنا ممکن ہو سکا ہے۔ خلائی دوربینوں میں ان تحقیقات سے حاصل شدہ معلومات کا استعمال کیا جائے گا۔

اس سال علم کیمیا کا نوبل انعام تین سائنسدانوں کو ملا ہے۔ انعام کی رقم فرانس کے دائیوس شاون اور امریکہ کے رابرٹ گربس اور رچرڈ شراک میں مساوی طور پر تقسیم ہوگی۔ ان تینوں نے کاربن پر کام کیا ہے۔ ان کے انکشافات کی روشنی میں بعض کارآمد دوائیں تیار ہوں گی اور آج کل ساری دنیا میں پلاسٹک اشیا کے خلاف جو مہم چل رہی ہے اس میں اس اعتبار سے کمی ہوگی کہ کاربن پر تازہ تحقیق کے نتیجے میں پلاسٹک کی جو اشیا بنیں گی وہ کم نقصان دہ ہوں گی۔ غذائی اشیا کو محفوظ کرنے کے طریقوں میں بھی اس نئی تحقیق سے مدد ملے گی۔ شاون کی عمر اس وقت 74 سال ہے اور ایک عرصے کے بعد کسی فرانسیسی سائنسداں کو نوبل انعام کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ گربس اب 63 سال کے ہیں اور کیلی فورنیا کے انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں پروفیسر ہیں۔

اس سال طب کا نوبل انعام دو آسٹریلیائی سائنسدانوں کو ملا ہے جن کے نام بیری مارشل اور رابن وارن ہیں۔ اب تک سمجھا جاتا تھا کہ پیٹ کا السر دماغی تناؤ اور الجھن سے ہوتا ہے لیکن مارشل اور وارن نے ثابت کیا ہے کہ یہ السر بعض مخصوص جراثیم کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اس السر کا علاج اینٹی بایوٹکس سے ہو سکتا ہے۔ وارن کی عمر 68 سال ہے اور مارشل 54 سال کے ہیں۔ ان سائنسدانوں نے وہ جرثومہ دریافت کیا ہے جس سے پیٹ کی بیماریوں کے علاج میں بہت مدد ملے گی۔ اگرچہ اپنی تحقیق کی وجہ سے ڈاکٹر بیری مارشل کو عالمی شہرت حاصل ہوئی ہے لیکن خود مارشل کی بیوی ان کو مسخرا کہتی ہیں اور ان کے دوست احباب انھیں نیم حکیم کہا کرتے ہیں۔ بیری مارشل ایک عجیب و غریب شخص ہیں۔ جراثیم سے متعلق اپنی تحقیق کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے ان جراثیم سے بھرا ہوا ایک محلول پی لیا تھا اور خود بری طرح بیمار پڑ گئے تھے۔ لیکن اس طرح انھوں نے ثابت کر دیا کہ معدے کا السر جراثیم کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس کا علاج ممکن ہے۔ مارشل کے چار بچے ہیں۔ ان کی بیوی ایڈریانا نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ "میرے شوہر ہمیشہ احمقانہ حرکتیں کرتے ہیں۔ ان کے مذاق بھونڈے اور گفتگو بے تکی ہوتی ہے۔" لیکن یہی مسخرا شوہر آج ان کے لیے باعثِ فخر ہے۔

امن کا نوبل انعام اس سال انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی (جو اقوام متحدہ کا ایک ادارہ ہے) اور اس کے صدر مصری نژاد محمد البرادی کو ملا ہے۔ یہ انعام امن کے لیے ان کی کوششوں اور نیوکلیائی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے ان کی مساعی کو خراجِ تحسین کے طور پر دیا جا رہا ہے۔ محمد البرادی نے اس موقعے پر کہا کہ اس اعزاز سے میری اور میرے ساتھیوں کی حق گوئی اور ثابت قدمی کو تقویت ملی ہے۔ وہ جوہری طاقت کے پُرامن استعمال کے حامی

ہیں اور مہلک ہتھیاروں کی تیاری کے سخت خلاف ہیں۔

محمد البرادی کو امریکہ کی تنقید کا سامنا کرنا پڑا تھا جب انھوں نے اس بات کی پُر زور حمایت کی تھی کہ عراق پر حملے سے قبل امریکہ کو وہاں ہتھیاروں کی تلاش کے لیے کچھ اور وقت دینا چاہیے۔ اسی طرح محمد البرادی نے ایران پر تحدیدات عاید کرنے کی امریکہ کی کوشش کی بھی مخالفت کی۔ امریکہ کی ناراضگی کے باوجود البرادی تیسری مرتبہ چار سال کے لیے اٹامک انرجی ایجنسی کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ نوبل انعام کمیٹی نے صاف کہا ہے کہ محمد البرادی کو یہ انعام ان کی صلاحیتوں کے لیے دیا گیا ہے اور اسے امید ہے کہ اس سے اقوام متحدہ کے ہاتھ مضبوط ہوں گے۔

ادب کا نوبل انعام اس سال برطانوی ڈراما نویس اور شاعر ہیرالڈ پنٹر کو دیا گیا ہے۔ ہیرالڈ پنٹر اکتوبر کے مہینے میں 75 سال کی عمر کو پہنچے ہیں۔ وہ ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد درزی تھے۔ پنٹر نے اپنی زندگی کا آغاز بحیثیت اسٹیج فنکار کیا۔ انھوں نے 1957 سے ڈراما نویسی شروع کی۔ ان کا پہلا ڈراما ''کمرہ'' تھا۔ اس کے بعد ''چوکیدار'' اور ''گھر کو واپسی'' سے ان کو شہرت ملی۔ ان کی ایک فلم ''فرنچ لیفٹننٹ کی بیوی'' کے لیے ان کو آسکر ایوارڈ کے لیے بھی نامزد کیا گیا تھا۔ ان کا اسلوب اتنا منفرد ہے کہ ان کے طرز تحریر کے لیے ایک خصوصی ترکیب ''پنٹری طرز تحریر'' وضع کی گئی ہے۔ پنٹر نے 31 ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کے ناول اور شعری مجموعے بھی مقبول ہوئے ہیں۔

ہیرالڈ پنٹر اپنے فن کے بارے میں کسی سے بات نہیں کرتے۔ اگر کبھی ان کے ڈراموں کے اداکاران سے کچھ سوال کرتے ہیں تو وہ ان سے کہتے ہیں کہ اپنے کام سے کام رکھو، اپنے مکالمے ادا کرو۔ اس سے زیادہ مت پوچھو۔

معاشیات کا انعام اس سال دو ماہرین معاشیات کو ملا ہے۔ رابرٹ آمن ایک یہودی نژاد امریکی شہری ہیں اور ٹامس شلنگ ایک امریکی پروفیسر ہیں۔ ٹامس شلنگ کی عمر 84 سال ہے اور رابرٹ آمن 75 سال کے ہیں۔ ان لوگوں نے گیم تھیوری کی مدد سے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ افراد اور قوموں کے درمیان کبھی باہمی تعاون اور کبھی تناؤ اور عدم اعتماد کی کیفیت کیوں ہوتی ہے۔ تجارتی کمپنیاں آپس میں کیوں جھگڑتی ہیں۔ رقم کے معاملات میں منصوبہ بند جرائم کس طرح ہوتے ہیں، عالمی جنگوں کے اسباب کیا تھے وغیرہ۔ پروفیسر مارشل نے سرد جنگ کے زمانے میں امریکہ اور روس کے درمیان اختلافات کا تجزیہ بھی کیا تھا۔

اس سال جن لوگوں کو نوبل انعام ملا ہے ان کی تحقیقات کئی برس پرانی ہیں۔ اسی لیے آسٹریلیا کے سائنسداں پیٹر ڈوہرٹی نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ تحقیقاتی کام کرنے والوں اور ادیبوں شاعروں کو اپنی صحت کا خصوصی خیال رکھنا چاہیے۔ انھیں طویل عمر تک جینے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ لوگ نوبل انعام کے لیے ان کے نام پر غور کر سکیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے ڈوہرٹی کی بات کو ہم مذاق بھی سمجھیں تب بھی ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان کے سائنسدانوں کو زیادہ محنت کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں، صرف کڑی محنت اور لگن کی ضرورت ہے۔ کیا پتہ آئندہ برسوں میں ہمارے سائنسداں بھی ایسا نام اور مقام حاصل کریں کہ نوبل اکیڈمی کے ارباب اختیار ہمارے سائنسدانوں اور دانشوروں کی قابلیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

3-5-805, Hyderguda,Hyderabad-500029

◆ ◆ ◆

تنقیدی افکار

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی کے مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1983 میں چھپا تھا۔
1986 میں اسے ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا۔ اس میں نظری تنقید،
نظریۂ نقد اور مشرق و مغرب کی شعریات کے حوالے سے اہم مضامین
شامل ہیں۔ تین نئے مضامین کے اضافے کے ساتھ کونسل نے
اس اہم کتاب کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 348، قیمت: -/148 روپے

عروض، آہنگ اور بیان

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی ہمارے عہد کے معتبر ترین علمائے ادب میں ہیں۔
اس کتاب میں ان کے دس اہم مضامین شامل ہیں جن میں شاعری کے محاسن
و معائب کے مروجہ پیمانوں کے جواز اور عدم جواز پر مدلل گفتگو کی گئی ہے—
اس کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر تین نئے مضامین کے اضافوں کے
ساتھ قومی اردو کونسل نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔

صفحات: 340، قیمت: -/144 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

انور ادیب

خلائی تحقیقات — ایک جائزہ

تجسس کا جذبہ انسان کو نئی نئی دریافتوں پر ابھارتا رہتا ہے۔ کھوج اور تحقیق کے اسی جذبے نے انسان کو خلائی تحقیقات کی طرف مائل کیا جس کے نتیجے میں آج وہ نہ صرف چاند پر پہنچنے میں کامیاب ہوا ہے بلکہ دیگر سیاروں پر بھی کمندیں ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یوں تو مختلف ممالک خلائی تحقیقات میں مصروف ہیں لیکن اس سلسلے میں پہلی تاریخ ساز کامیابی روس (سابق یو ایس ایس آر) کے سائنس دانوں کے ہی حصے میں آئی۔ 4 اکتوبر 1957 میں روس نے سب سے پہلے اپنا خلائی جہاز اسپٹنک-1 (Sputnik-1) کو خلا میں بھیجا۔ خلائی تحقیقات میں یہ ایک زبردست پیش رفت تھی۔ اس واقعے کو خلائی تحقیقات کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

اسپٹنک-1 کی کامیاب اڑان سے سائنس دانوں کا حوصلہ بلند ہوا۔ انھوں نے خلا میں انسانی زندگی پر ہونے والے اثرات معلوم کرنے کے لیے ایک کتیا کو خلا میں بھیجا۔ اس کی بعافیت واپسی کے بعد اس کی جانچ نے ثابت کر دیا کہ خلا میں انسانی زندگی کے امکانات روشن ہیں۔

روس اور امریکہ نے اپنے مختلف خلائی پروگراموں کے ذریعے اپنی خلائی تحقیقات جاری رکھی جن میں خلائی جہاز explore-1، Luna-3 اور 4 اور Mariner-2 کے کارنامے قابل ذکر ہیں۔ ان تحقیقات کے نتائج کافی حوصلہ افزا تھے۔ لہٰذا انسان کو خلا میں بھیجنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ ایک بار پھر روس نے اس سلسلے میں اپنی برتری ثابت کردی۔ اس نے اپریل 1961 میں اپنے خلاباز یوری گگارن کو خلا میں بھیجا جس نے زمین کے گرد چکر لگا کر اور بخیر وخوبی زمین پر واپس آ کر روسی سائنس دانوں کو ایک نیا حوصلہ دیا۔ جون 1963 میں روس ہی نے پہلی خلا باز خاتون ولنٹینا ترشکووا (Valentina Tareshkova) کو خلا میں بھیجنے کا اعزاز حاصل کیا۔

1965 میں امریکہ نے جیمنی (Gemini) خلائی جہاز کے ذریعے انسان کو خلا میں بھیجا جس نے خلا میں چہل قدمی کی۔ یہ انسان کو چاند پر اتارنے کا امریکی منصوبے کا ایک حصہ تھا۔ چنانچہ 21 جولائی 1969 کو امریکہ نے اپنے دو خلابازوں نیل آرم اسٹرانگ اور ایڈون ایلڈرن کو خلائی جہاز اپولو-11 کے ذریعے خلا میں بھیجا۔ نیل آرم اسٹرانگ نے ایگل نامی خلائی گاڑی سے چاند کی سطح پر قدم رکھا۔ خلائی تحقیقات کی تاریخ میں یہ واقعہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ چاند کی سطح سے مٹی زمین پر لائی گئی اور اس کا کیمیائی تجزیہ کرکے قیمتی معلومات حاصل کی گئیں۔

مئی 1973 میں امریکہ نے اپنا پہلا خلائی اسٹیشن (Skylab) خلا میں قائم کیا۔ اس خلائی اسٹیشن پر 3 امریکی خلا بازوں نے 740 گھنٹے سے زیادہ قیام کیا۔ اس سے سائنس دانوں کو قیمتی معلومات حاصل ہوئیں اور ان کے اس خیال کو تقویت ملی کہ خلا میں انسان کا قیام مضر اثرات کے بغیر ممکن ہے۔ 6 سال خلا میں گردش کرنے کے بعد اسکائی لیب کا محور (orbit) تیزی سے تباہ ہونا شروع ہوا اور 11 رجولائی 1979 کو یہ خلائی اسٹیشن تباہ ہوگیا۔ اس کے ٹکڑے آسٹریلیا اور بحر ہند میں جا گرے۔

1961 اور 1965 کے درمیان روس کا خلائی جہاز واسٹک (Vostok) 6 روسی خلابازوں کے ساتھ خلا میں گردش کرتا رہا۔ 1973 میں دو روسی خلابازوں کو روسی خلائی جہاز سویوز (Soyuz) کے ذریعے خلا میں بھیجا گیا۔ اور 1975 میں سویوز اور اپولو (امریکی خلائی جہاز) خلا میں جڑ گئے۔ اسے روسی اور امریکی خلائی سائنس دانوں کے تعاون کی ایک عمدہ مثال قرار دیا گیا۔

3 اپریل 1984 ہندوستانی خلائی تحقیقات کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اسی دن اسکواڈرن لیڈر راکیش شرما کو روسی خلائی جہاز سویوز (Soyuz-11 T) کے ذریعے خلا میں بھیجا گیا جو روسی خلائی اسٹیشن سیلوٹ (Salyut-7) میں 7 دن قیام کر کے بعافیت زمین پر واپس آیا۔ اس خلائی اسٹیشن پر روس خلابازوں نے 8 رفروری 1984 سے 2 اکتوبر 1985 تک 237 دن قیام کر کے ایک ریکارڈ قائم کیا۔ یہ خلائی اسٹیشن 6 فروری 1991 کو بحر اوقیانوس (Atlantic Ocean) میں ٹوٹ کر گر گیا۔

20 فروری 1986 کو روس نے ایک اور خلائی اسٹیشن میر (MIR) خلا میں قائم کیا۔ اس میں روسی خلا بازوں نے 326 اور 366 دن رہنے کا ریکارڈ قائم کیا۔ 51 سالہ ایک فزیشین (Physician) ویلاری پولیا کوف نے بھی 427 دن اس خلائی اسٹیشن میں قیام کیا اور 22 مارچ 1955 کو وہ بعافیت زمین پر واپس آیا۔

29 جون 1955 کو ایک بار پھر دو عظیم طاقتوں (امریکہ اور روس) نے خلائی تحقیقات میں تعاون کا مظاہرہ کیا۔ امریکی خلائی شٹل ڈسکوری اور روسی خلائی اسٹیشن میر آپس میں جڑ گئے۔ اس خلائی اسٹیشن میں ایک امریکی مسز لوسنڈ (Lucid) نے 6 ماہ گزارا۔ اسے بعافیت زمین پر واپس لایا گیا۔

یہاں روسی خلائی اسٹیشن میر کے متعلق چند دلچسپ باتوں کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ میر کو ایک نہایت مقبول امریکی مسٹر والٹ اینڈرسن نے دو کروڑ ڈالر کے عوض خلائی ہوٹل (space hotel) میں تبدیل کرنے کی پیش کش کی تھی۔ ایک فلم ساز نے ایک خلائی فلم A Final Journey کے نام سے بنانے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن افسوس کچھ تکنیکی خرابی کی وجہ سے یہ 22 مارچ 2001 کو تباہ ہوگیا۔ اس طرح میر سے متعلق ان کے منصوبے مکمل نہیں ہو سکے۔

امریکی خلائی تحقیقاتی ادارہ ناسا (NASA) نے متعدد خلائی شٹل خلا میں بھیجے جن میں Discovery, Challenger, Columbia enterprise viking اور Atlantis قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ Ranger, Mariner, Galelio, Voyger اور Surveyor خلائی جہازوں سے سائنس دانوں نے سائنسی تحقیقات میں بیش بہا معلومات حاصل کیں۔ مئی 1983 میں امریکہ نے اپنی پہلی خاتون خلاباز Sally Ride کو خلا میں بھیجا۔

امریکی سائنس دانوں کو اس وقت زبردست جھٹکا لگا جب 20 جنوری 1986 کو چیلنجر ایک حادثے کا شکار ہوگیا جس میں 6 خلاباز اور ایک اسکول ٹیچر ہلاک ہوگئے۔

امریکہ نے سرخ سیارہ مریخ (Mars) کے متعلق تحقیقات کے لیے Mars Observer نامی خلائی جہاز کو خصوصی مشن پر 25 ستمبر 1992 کو خلا میں بھیجا جو تکنیکی خرابی کی وجہ سے اگست 1993 میں خلا میں گم ہوگیا۔ اس طرح یہ مشن ناکام ہوگیا۔

4 جولائی 1997 کو خلائی تحقیقات کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا جب ایک امریکی خلائی جہاز Pathfinder مریخ پر اترا۔ اس مشن سے سائنس دانوں کو قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔

ہندوستان میں خلائی تحقیقات کا آغاز قومی کونسل برائے خلائی تحقیقات (National Council for Space Research) کی تشکیل (1962) سے ہوتا ہے۔ 1969 میں ہندوستانی خلائی تحقیقاتی ادارہ (Indian Space Research Organization) اور 1972 میں خلائی میشن جیسے اداروں کے قیام سے خلائی تحقیقات کو کافی فروغ حاصل ہوا۔

1975 ہندوستانی خلائی تحقیقات کی تاریخ میں یادگار سال ہے۔ اسی سال ہندوستان نے اپنا پہلا مصنوعی سیارہ (Satellite) آریہ بھٹ کے نام سے (جو قدیم ہندوستان کے ممتاز ماہر فلکیات اور ریاضی داں گزرے ہیں) روسی راکٹ کے ذریعے خلا میں بھیجا اور 3 اپریل 1984 کو پہلا ہندوستانی خلاباز اسکواڈرن لیڈر راکیش شرما کو ہند روسی خلائی مشن کے تحت خلا میں بھیجا گیا۔ ان کی بعافیت واپسی ہوئی۔ یہ واقعہ ہندوستانی خلائی سائنس دانوں کے لیے بے حد حوصلہ افزا تھا۔

19 نومبر 1997 کو 41 سالہ پہلی ہندوستانی خاتون ڈاکٹر کلپنا چاؤلہ کو خلا میں بھیجا گیا۔ انھیں 16 دن کے خلائی مشن پر امریکی شٹل کولمبیا کے ذریعے خلا میں بھیجا گیا۔ ان کی بعافیت واپسی کے بعد دوسری بار انھیں جنوری 2003 میں امریکی شٹل کولمبیا کے ذریعے 6 امریکی سائنس دانوں کے ساتھ خلا میں بھیجا گیا۔ بدقسمتی سے یہ شٹل یکم فروری 2003 کو حادثے کا شکار ہوگیا جس میں ڈاکٹر چاؤلہ سمیت 6 امریکی سائنس داں ہلاک ہوگئے۔

چین کی خلائی تحقیقات کی نمایاں کامیابی کا انکشاف اس وقت ہوا جب اس نے اپنے وسائل اور ٹیکنالوجی کی مدد سے اپنے خلاباز کرنل یانگ لیوی کو 15 اکتوبر 2003 کو خلا میں بھیجا۔ اس کی واپسی سے ان کے سائنس دانوں کا حوصلہ اس قدر بڑھا کہ اب وہ دوسرے خلاباز کو اپنے خلائی تحقیقاتی مشن پر روانہ کر رہے ہیں۔

سائنس دانوں نے مریخ کے متعلق تحقیقات پر بھی توجہ کی ہے۔ 1965 میں امریکی خلائی جہاز Mariner-4 نے مریخ کی تصویریں بھیجی تھیں۔ ان تصویروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں بڑی بڑی دراڑیں (crates) موجود ہیں۔ مریخ کی تحقیقات سے متعلق برطانوی سائنس دانوں کی کاوشیں بھی قابل ذکر ہیں۔ 19 دسمبر 2003 کو برطانوی سائنس دانوں نے Beagle-2 خلائی جہاز مریخ کے لیے روانہ کیا اور 25 دسمبر 2003 کو امریکہ نے خلائی جہاز اسپرٹ کو مریخ کے لیے روانہ کیا۔ دونوں خلائی جہاز مریخ پر اترے۔ ان کی حاصل کی ہوئی تصویروں سے واضح ہوتا ہے کہ مریخ کی سطح پر برف کی تہیں ہیں جن میں حرکت اور تبدیلی کے آثار پائے گئے ہیں۔ چٹان کے مشاہدے اور برف کی موجودگی سے پانی کے آثار ملتے ہیں۔ اور مریخ پر کسی نہ کسی صورت میں زندگی کے امکانات موجود ہیں۔

مریخ کو صدیوں سے جنگ کا دیوتا سمجھا جاتا رہا ہے لیکن سائنس داں اس دیوتا کو مسخر کرنے میں مصروف ہیں۔ خلائی تحقیقات میں کامیابیوں سے سائنس دانوں کے حوصلے بلند ہیں۔ چاند کے علاوہ دیگر سیاروں کی تسخیر کی کوششیں بھی جاری ہیں۔

Ibrahim Manzil, Mosaddi Mohalla, Railpar,
Asansol - 713302 (W.B.)

□□□

محمد خلیل

کیا گدھ محفوظ رہ سکیں گے؟

گدھ ہمارے یہاں پائے جانے والے عام پرندوں میں سے ایک ہے جسے ہم شہر سے باہر آبادی سے دور ان علاقوں میں دیکھتے ہیں جہاں گندگی، سڑی گلی چیزوں کے پھینکنے سے ہوتی ہے وہاں مرے ہوئے جانور بھی ڈالے جاتے ہیں۔ ایسے ہی جگہوں پر گدھ جھنڈ میں اونچے درختوں پر بیٹھے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں۔ ایسے سنسان علاقوں میں ان مرے ہوئے جانوروں کو یہ اپنی غذا بناتے ہیں لیکن اب یہی گدھ کہیں نظر نہیں آتے اور ان کی تعداد ہمارے ملک میں مسلسل کم ہوتی جارہی ہے۔ یہ مسئلہ ہمارے ملک تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ امریکہ، کناڈا اور دوسرے ممالک میں بھی ان کی تعداد مسلسل کم ہورہی ہے یہاں تک کہ سائبیر یا قزاکستان تک پائے جانے والے گدھ بھی ختم ہونے کے دہانے پر پہنچ گئے ہیں۔ مغربی مدھیہ پردیش کے میدانی علاقوں، راجستھان، ہماچل پردیش، پنجاب، ہریانہ اور اتر پردیش میں بھی اب گدھ کچھ مقامات پر مشکل سے نظر آتے ہیں۔ جس کی وجہ سے جانوروں کی لاشیں ایسے مقامات پر جہاں یہ پہلے موجود ہوتے تھے ہفتوں سڑتی رہتی ہیں اور گدھوں کا وہاں گزر نہیں ہوتا۔

قدرت نے ایسے کئی پرندے اور جانور پیدا کیے ہیں جو ماحول میں صفائی کے ذمے دار ہیں کیونکہ وہ اپنی عادت کے مطابق ان سڑی گلی چیزوں کو اپنی غذا کے طور پر کھا جاتے ہیں۔ اس طرح ایسے صفائی کرنے والے پرندوں اور جانوروں کی موجودگی صحت مند ماحول بنائے رکھنے میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اب ان کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گدھ کی شہرت صفائی کرنے والے پرندے کے طور پر رہی ہے۔ وہ منظر بھی لوگوں کو یاد ہے جب دیہی علاقوں اور قصبوں میں مرے ہوئے جانوروں کو رہائشی علاقوں سے دور پھینک دیا جاتا تھا جہاں تھوڑی ہی دیر بعد سیکڑوں کی تعداد میں ان کو کھانے کے لیے گدھ آپہنچتے تھے۔ لیکن آج یہ لاشیں ہفتوں تک پڑی رہتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علاقے میں بدبو پھیل جاتی ہے۔ اس کے برخلاف شہری علاقوں کی حالت مزید نازک ہوگئی ہے جہاں ان کے پڑے رہنے سے شہری علاقے آلودگی کے مسائل سے دوچار ہورہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر گدھوں کی تعداد میں کمی کس وجہ سے واقع ہورہی ہے۔ ماہرین کے مطابق اس کی ایک بڑی وجہ شہری علاقوں کا تیزی سے پھیلنا ہے جو صنعتوں کے بڑھنے سے ہوا ہے وہیں دوسری جانب جنگل کے علاقے کم ہوتے جارہے ہیں۔ بڑے پروں والے پرندے گدھ بڑے درختوں پر اپنے گھونسلے بناتے ہیں اور وہیں اپنے بچے پیدا کرتے ہیں۔ یہی ان کی قدرتی رہائش ہے لیکن جنگلوں کے اجڑنے سے ان کی تعداد بھی کم ہوتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ اچانک پیدا شدہ آفات اور ان سے پیدا ہوئی بیماریوں سے بھی گدھوں کی تعداد میں کمی آئی ہے۔ آج ساری دنیا میں فصلوں کو بچانے کے لیے کیمیائی کیڑے مار دواؤں کا استعمال بڑے پیمانے پر ہورہا ہے۔ ماہرین تجربات سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کیمیائی کیڑے مار دواؤں کی وجہ سے گدھوں کی تعداد عالمی سطح پر کم ہوئی ہے۔ گذشتہ دنوں عالمی ادارۂ صحت نے اپنے ایک تحقیقی جائزے کے بعد یہ انکشاف کیا ہے کہ ہر سال تیس لاکھ لوگ ان کیڑے مار دواؤں کے خراب اثرات سے بیمار پڑتے ہیں جن میں تقریبا بیس لاکھ لوگوں کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ ان حالات میں آپ ان پرندوں کے مسائل کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو چارے پیڑ پودوں اور ایسی چیزوں پر اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ راجستھان کے بھرت پور علاقے میں گھانا قومی باغ ہے۔ یہاں مختلف اقسام کے پرندے اور جانور خاص وقت پر آتے رہتے ہیں۔ ان میں گدھوں کی بھی ایک بڑی تعداد یہاں قیام کے لیے آتی تھی لیکن اب ان کی تعداد مسلسل کم ہوتی جارہی ہے۔

ممبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی (ممبئی) کے پرندوں کے ماہرین کا کہنا ہے کہ کچھ علاقوں میں گدھوں کی تعداد گھٹ کر جو دو ہزار تک تھی اب بہت کم ہوگئی ہے۔ ماہرین کے ایک اندازے کے مطابق ان کے گھونسلوں کی تعداد تین سو تک تھی اب گھٹ کر دس سے بھی کم ہوگئی ہے۔ ان کے گھونسلوں میں بچے بھی مرے ہوئے ملے ہیں۔

سینٹر فار سائنس اینڈ انوائرمنٹ (مرکز برائے سائنس و ماحولیات) اور ممبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے پرندوں کے ماہرین ان کی گھٹتی ہوئی تعداد کے مسائل پر ہم خیال ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان گدھوں کی اچانک موت کی خاص وجہ ڈی ڈی ٹی اور بی ایچ سی جیسی کیڑے مار کیمیائی دواؤں کا چھڑکاؤ ہے جو مرے ہوئے جانداروں میں موجود رہتا ہے اور انھی سڑی گلی لاشوں کو کھا کر گدھ اپنی بھوک مٹاتے ہیں۔ کچھ ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ مختلف قسم کی کھادوں، کیڑے مار اجزا کی موجودگی بھی اس مسئلے کو بڑھا رہی ہے۔ کیڑے مار دواؤں کے کیمیائی اثرات غذائی اشیا کے ساتھ بڑھتے جارہے ہیں۔ ماہرین تحقیق کے

دوران اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کیڑے مار کیمیائی اثرات تقریباً سبھی مقامات پر موجود ہیں۔ یہ کیڑے مار دوائیں کیچوے سے انسانی جسم تک موجود پائی گئی ہیں۔ گدھوں کے ساتھ ہی کیڑے مار دواؤں کے اثرات سارس، فاختہ اور بسٹرڈ میں بھی پائے گئے ہیں۔ 1990 کے ایک تحقیقی جائزے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ گدھوں کے نسجوں (ٹشوز) میں کبوتروں کے مقابلے میں چار گنا زیادہ کیڑے مار دواؤں کے کیمیائی اثرات موجود ہوتے ہیں۔ پانی میں رہنے والی چھوٹی مچھلیاں صرف چھوٹے پودوں اور کیڑے مکوڑوں کو اپنی غذا کے طور پر کھاتی ہیں۔ لیکن انسان اور بڑی جسامت والے جاندار اس سے کہیں زیادہ مقدار میں غذا حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے جسم میں کیڑے مار دواؤں کی مقدار زیادہ پہنچتی ہے اور وقت کے ساتھ جس قدر غذا کی مقدار بڑھتی جاتی ہے، کیڑے مار دواؤں کی کیمیائی سطح بھی بڑھتی رہتی ہے۔ غذا کے ذریعے پہنچنے والی کیمیائی کیڑے مار دوائیں جسم میں جمع ہوتی رہتی ہیں اور پھر اپنے خطرناک اثرات دکھاتی ہیں اور جسم میں ہارمون کی کارکردگی کو متاثر کرتی ہیں۔

ہارمون میں تبدیلی کے پیش نظر بچوں کی پیدائش کا عمل بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ نر جانداروں میں مادہ اور مادہ جانداروں میں نر کی عادتوں کو پیدا کر سکتا ہے۔ اس طرح جوان عمر کے ہارمونوں کے متاثر ہونے سے پیدائش کی قوت کمزور پڑتی ہے یا ختم ہو سکتی ہے۔ یہی نہیں یہ عام خلیات کو کینسر کے اثرات سے متاثر کر دیتی ہے۔ ایک مرتبہ جب جسم کے اندر ڈی ڈی ٹی، ڈی ڈی ای میں تبدیل ہو جاتا ہے تو یہ دوسرے کیمیا کے مقابلے میں کینسر پیدا کرنے والا ایک طاقتور کیمیا بن جاتا ہے۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ جانوروں میں درد کو کم کرنے کے لیے علاج کے دوران استعمال کی جانے والی ایک عام دوا جس کا نام ڈکلوفینک ہے گدھوں کی تقریباً 90 فیصد موت کی ذمے دار ہے اور اس دوا کے اجزا مرے ہوئے جانوروں کی لاشوں سے گدھوں کے جسم میں کھانے کے بعد پہنچتی ہیں جس سے وہ مر جاتے ہیں۔ لیکن کچھ دوسرے ماہرین کا خیال ہے کہ کیڑے مار دواؤں یعنی پیسٹی سائیڈ سے گدھ نہیں مرے ہیں کیونکہ مرے ہوئے گدھوں کے نمونے میں ان دواؤں کے کیمیائی اثرات نہیں پائے گئے لیکن خون کے نمونوں میں وائرس کی موجودگی تھی۔ اس طرح گدھوں کی موت کی وجہ برڈ فلو بتائی گئی۔ یہ عالمی سطح پر ایک خطرناک نشاندہی تھی اس لیے کہ اس طرح دوسرے پرندے بھی متاثر ہو سکتے ہیں اور اس سے انسان کو بھی خطرات کے امکانات نظر آئے۔ اس سے تحفظ کے لیے عالمی آرنتھولوجسٹ سوسائٹی نے ذمے داری لے لی۔ ماہرین نے جو تحقیق کی اس میں سب سے پہلے گدھوں کے ذریعے کھائی جانے والی مختلف چیزوں کی جانچ تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ دیکھا کہ زیادہ تعداد میں گدھوں کی گردن جھکی ہوئی تھی جس سے ان کی اندرونی گھبراہٹ کا انکشاف ہوتا ہے۔ ماہرین نے یہ بھی دیکھا کہ نسل کو بڑھانے کے موسم میں بہت سے گدھ گھونسلے بھی نہیں بناتے تھے لیکن جو گھونسلے بنا لیتے تھے وہ گھونسلوں میں انڈے نہیں دیتے تھے۔ اس طرح ان کی تعداد میں کمی ہونے کی ایک یہ بھی وجہ سامنے آئی۔ کچھ گدھوں کی جانچ کے بعد تحقیق سے ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کے گردے کام نہیں کر رہے ہیں۔ گہرائی تک پہنچنے کے لیے ماہرین کو جانوروں کے اسپتال سے یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ ایک ڈکلوفینک نامی دوا جانوروں کے ڈاکٹر سب سے زیادہ استعمال میں لا رہے تھے اور اس کے انجکشن ماہرین کئی بار لگا رہے تھے۔ دیہی علاقوں میں زخمی جانوروں کے علاج میں ڈاکٹر اس کا انجکشن لگا دیتے ہیں۔ ان جانوروں کو مرنے کے بعد شہر کے باہر پھینک دیا جاتا ہے پھر مردہ جانوروں میں اس دوا کو گدھ کھا لیتا ہے اور یہ ان کے لیے زہریلی ثابت ہوتی ہے اور اس طرح گدھوں کی موت ہو جاتی ہے۔

حال ہی میں ہمارے ماحول کو صاف اور ستھرا کرنے والے گدھوں کی تعداد میں بہت زیادہ کمی کو روکنے کے لیے برطانیہ کی رائل براڈ سوسائٹی کی مدد سے مغربی بنگال میں گدھوں کی حالت میں بہتری پیدا کرنے کے لیے نسل بڑھانے کی کوشش شروع کی گئی ہے۔ اس کے لیے کولکاتہ سے کافی دور دارجلنگ کی پہاڑیوں میں ایک مناسب جگہ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ رائل برڈ سوسائٹی کو گدھوں کی نسل کشی کے سلسلے میں طویل تجربہ ہے اس طرح اس سوسائٹی سے مدد لی جا رہی ہے۔ یہ ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کولکاتہ میں دس سال قبل گدھ بڑی تعداد میں آسمان میں دور تک اڑتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ان کی صحیح تعداد البتہ معلوم نہیں ہے۔ اس کے بعد گذشتہ کئی سال پہلے بھی کولکاتہ کے مشرقی علاقے میں جہاں کوڑہ کرکٹ کا انبار ہوتا ہے، سیکڑوں گدھ نظر آتے تھے لیکن اب تو اتفاقیہ طور پر ہی کوئی گدھ نظر آتا ہے۔ اس طرح جائزے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ سرسبز علاقوں میں ان کی تعداد تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ بقول ماہرین گدھوں کی تعداد تقریباً دو سو کے قریب بتائی گئی ہے جس میں کولکاتہ شہر کے پچاس گدھ بھی شامل ہیں۔ اسی طرح بھرت پور کے قریب بیانہ (راجستھان) کا دنیا کے سب سے زیادہ گدھ پائے جانے والے علاقوں میں شمار ہوتا رہا ہے لیکن آج وہاں بھی گدھوں کی تعداد بہت کم ہے۔ راجستھان کے باڑھ میر علاقے میں اب گدھ باقی نہیں بچے ہیں اس کی وجہ پچھلے کچھ برسوں میں اس کا شکار کیا جانا بتایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کو مار کر اس کے جسم کے حصوں سے مقوی دوائیں تیار کی جاتی ہیں۔ آندھرا پردیش کے ایک قصبے پٹاپا میں رہنے والے آدیواسیوں کی مرغوب غذا

گدھ کا گوشت ہے۔ جنوبی ہندوستان کے کئی اور علاقوں میں قبائلی لوگ بھی اس کا گوشت کھانا پسند کرتے ہیں۔ ان وجوہات سے بھی ان کی تعداد کم ہورہی ہے۔ مدھیہ پردیش کے جھابوا نامی علاقے کے لوگ غذا کی کمی کے باعث گدھ کا گوشت کھاتے ہیں اور اس کے کچھ حصوں سے مقوی دوا بھی تیار کرتے ہیں۔ کچھ نیم حکیم اس کے کچھ حصوں سے قوت باہ بڑھانے والی دوائیں تیار کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کا استعمال جادو ٹونے میں بھی کرتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو جانوروں کی لاشوں کو ان کے سامنے ڈال کر ان کا شکار کرتے ہیں۔ دوسری جانب ان کو غیر قانونی طور پر شکار کے بعد گدھوں کی لاشوں کو دوسرے ممالک میں فروخت کیا جاتا ہے۔ متذکرہ مسائل کی روشنی میں گدھوں کی تعداد جس تیزی کے ساتھ کم ہورہی ہے یہ خدشہ پیدا ہوگیا ہے کہ اس کو بچانے کی کوشش میں مزید تاخیر نہ ہوجائے اور ہمارے ماحولیات میں توازن قائم رکھنے والا گدھ دنیا سے ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے۔

عام طور پر گدھ کی بیس نسلیں پائی گئی ہیں۔ ان میں کنڈونسل کے گدھ بہت خونخوار ہوتے ہیں۔ مادہ گدھ نر سے چھوٹی ہوتی ہے۔ یہ فروری سے اپریل تک اپنا گھر بساتے ہیں۔ مادہ کتھئی داغ والے دو انڈے دیتی ہے، اڑنے میں گدھوں کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ یہ بہت اونچائی پر اڑتے ہوئے جیسے ہی اپنے شکار کو دیکھتے ہیں، بڑی پھرتی سے نیچے آجاتے ہیں۔ یہ بہت دور تک دیکھ سکتے ہیں۔ گدھ کو سب سے تیز کھانے والا پرندہ خیال کیا جاتا ہے۔ یہ دنیا کا ایک ایسا پرندہ ہے جو اپنے وزن کا دوگنا گوشت کھا لیتا ہے۔ اس طرح اس کو پالنا ایک مشکل کام ہے۔ اکثر کھانا نہ ملنے پر یہ بھوکے ہی رہتے ہیں۔ جو جنگلاتی زندگی میں ان سے قریب رہنے والے لوگوں کا کہنا ہے کہ گدھ ایک مہینے تک بھوکے رہ سکتے ہیں۔ یہ عام طور پر چھ یا آٹھ کی تعداد میں شکار کھاتے ہیں لیکن اپنا حصہ خاموشی سے کھاتے رہتے ہیں۔ یہ کھانے کے لیے ایک دوسرے سے بھی لڑتے نہیں لیکن سبھی گدھ گوشت خور نہیں ہوتے۔ کچھ گدھ پچاس سے سو سال تک زندہ رہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گدھ خود اپنا دشمن ہونے کی وجہ سے وقت سے کہیں پہلے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے بڑے پنکھ دیہی علاقوں میں کانٹے کی جھاڑیوں میں پھنس جاتے ہیں اور شہر میں بجلی کے تاروں میں پھنس جاتے ہیں اور ان کی موت ہوجاتی ہے۔ گدھ ماحول کو صاف رکھنے میں انسان کا سب سے بڑا مددگار ہے۔ اگر ہم اس کی زندگی پر غور کریں تو اسے سیدھا اور رحم دل پرندہ پاتے ہیں۔ یہ سب سے زیادہ افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بہت اونچائی پر پہنچ کر تیز اڑنا پسند کرتے ہیں تاکہ دور تک ان کی نظر جا سکے اور شکار ان کے ہاتھ آسکے۔ لیکن انسان کی غلطیوں سے ان کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ ضرورت ہے ان کے تحفظ کے لیے ٹھوس اقدامات کیے جائیں۔

#51 Dr Iqbal Lane, Batla House,
Jamia Nagar, New Delhi-110025

❑❑❑

ہندستان کا صنعتی ارتقا

مصنف: ڈاکٹر ڈی آر. گیڈگل، پروفیسر ایم صدیقی

ہندستان کی تاریخ میں 1857 ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس سال نہ صرف ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہوگئے بلکہ اسی کے بعد ہندستانیوں کی خود احتسابی کا دور بھی شروع ہوا جس کے نتیجے میں مختلف اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور ملک نشاۃ الثانیہ سے ہم کنار ہوا۔ 1857 کے بعد سے ہی صحیح معنوں میں ہندستان کی صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ اس کتاب میں 1860 سے 1939 تک ملک کے صنعتی ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 343، قیمت-/130 روپے

صنعتی تنظیم اور انتظام

مصنف: محمد احترام اللہ

آج کے صارفی سماج میں انتظامی شعبے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک کامیاب منتظم حال پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بی. کام کے طالب علموں کی ضرورت کو پورا کرتی ہے بلکہ علم دوست اردو قاری کو بھی جدید صنعتی شعبے اور معیشت کے دیگر رموز سے آگاہ کرتی ہے۔

صفحات: 606، قیمت-/149 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: مدن گوپال
ترجمہ: فاخر شبیر عباسی

پانی پت کی تیسری جنگ

1707 میں اورنگ زیب کے انتقال کے پچاس برسوں کے اندر مغل سلطنت کی عمارت منہدم گئی اور اودھ، لاہور، مرشدآباد اور حیدرآباد کے مغل گورنروں نے خودمختاری کا دعویٰ کردیا۔ اب مغل سلطنت کی جاہ وحشمت ماضی کا حصہ بن چکی تھی۔ اکبر اور شاہ جہاں کے ورثا کی حقیقت صفر سے زیادہ نہیں تھی۔ مغل دربار میں، بادشاہ ایسے مختلف گروہوں کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی بنا ہوا تھا، جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے وفاداریاں بدلتے رہتے تھے۔ تورانیوں، افغانوں اور ایرانیوں نے اپنے طاقتور حلقے بنا رکھے تھے جو طاقت کی بساط پر اہم کردار ادا کرتے تھے علاوہ ازیں ان میں مقامی سردار بھی تھے، اور ہر گروہ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتا رہتا تھا۔

بہار اور الہٰ آباد کے گورنر، یا سید برادران، حسین علی اور عبداللہ انفرادی طور پر اتنے طاقتور ہوگئے تھے کہ انھیں "بادشاہ ساز" تسلیم کیا جانے لگا تھا، اور یہ حقیقت بھی تھی، کیونکہ وہ مغل بادشاہ فرخ سیر کی موت کے ذمے دار تھے جسے زدوکوب کرکے زہر دیا گیا تھا۔ نیز وہ فاترالعقل محمد شاہ کو مغل سلطنت کی گدی پر بٹھانے کے لیے بھی ذمے دار تھے۔ اس نئے بادشاہ نے تقریباً بیس مہینوں کے اندر ہی اپنا دعویٰ جتایا اور سید برادران سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ حالانکہ، یہ قسمت کی ستم ظریفی تھی کہ اورنگ زیب کے جانشینوں کو اقتدار پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے نوجوان پیشوا بالا جی وشوناتھ کی مدد لینی پڑی جس نے شواجی کے بیٹے ساہو کو اپنی پناہ میں لے رکھا تھا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نوجوان پیشوا نے حکمرانوں کی ایک قطار کھڑی کردی جنھوں نے ایک طرف دکن سے پنجاب تک اور دوسری جانب بنگال تک مراٹھا اقتدار قائم کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ وشوناتھ کا عروج قابل دید تھا۔ یہاں تک کہ منظر عام سے غائب ہونے سے قبل سید برادران نے بھی پیشوا کی مدد حاصل کی تھی۔ اور پیشوا نے اپنی قیمت مانگی اور اسے حاصل بھی کیا۔ پیشوا کو مغل بادشاہ کی جانب سے جو رعایات حاصل ہوئیں ان میں (1) ان کے اپنے علاقوں پر آزادی یا مکمل اقتدار کا حق (2) چوتھ، یعنی دکن کی چھ ریاستوں سے حاصل ہونے والے محصول کا پچیس فی صد وصول کرنے کا حق، اور (3) سردیش مکھی، یعنی چوتھ کے علاوہ مزید دس فیصد مال گزاری وصول کرنے کا حق شامل تھا۔ اس طرح مغل وائسرائے کے ذریعے وصول کیے گئے محصول کا 35 فی صد مراٹھوں کے حصے میں جاتا تھا، جس کا تخمینہ 18 کروڑ روپئے تھا۔ مراٹھوں کو حاصل ہونے والی رعایات کے بدلے میں انھیں مغل سلطنت میں امن اور نظم و ضبط قائم کرنا تھا۔ ان پر محیط علاقوں میں بتدریج جملہ اطراف میں توسیع ہوتی گئی اور مزید رعایتیں اس کی بنیاد بنتی گئیں جسے مراٹھا معاہدہ (Maratha Confederacy) کے نام سے جانا گیا، جو کہ برصغیر میں ایک مستحکم طاقت بن گیا۔

پیشوا نہایت حوصلہ مند تھا۔ اس کا مقصد پورے ملک پر جنوب میں کرشنا ندی سے لے کر شمال میں اٹک (پنجاب) تک مراٹھا جھنڈا لہرانا تھا۔ اس مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں وشوناتھ کے بڑے بیٹے باجی راؤ نے ایک اہم کردار ادا کیا، جو ہندوستانی تاریخ کی سب سے حوصلہ مند شخصیات میں سے ایک تھا۔ سیاست اور انتظامی امور کے فن میں پوری طرح ماہر وہ ایک عظیم سپہ سالار تھا جس نے مراٹھا فوجوں کو یکے بعد دیگرے کئی فتوحات سے ہمکنار کیا۔ ساہو نے اسے اقبال مندی کی دعا دی اور کہا تھا: "تم واقعی ایک قابل باپ کے لائق بیٹے ہو۔ تم مراٹھا جھنڈے کو ہمالیہ کے اس پار بھی لہراؤ گے۔"

باجی راؤ نے ایسا کر دکھانے کی پرجوش کوشش کی۔ جب مغل وائسرائے نظام مراٹھا کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے دکن سے بھوپال کی طرف بڑھا تو اسے شکست سے دوچار ہونا پڑا اور مالوا اور گجرات سے دستبردار ہونے کے ساتھ ساتھ مزید 50 لاکھ روپئے جنگ کے ہرجانے کے طور پر ادا کرنے پڑے۔ یہ پیشوا کی فتح مندانہ زندگی کا نقطۂ عروج تھا۔

مراٹھوں کی بالادستی واضح طور سے قائم ہوچکی تھی۔ اس کے کچھ ہی عرصے کے اندر باجی راؤ دہلی پہنچا اور مغل بادشاہ کی بے بسی کو بے نقاب

"Turning Points of Indian History" جناب مدن گوپال کی بے حد اہم کتاب ہے جس میں ہندوستانی تاریخ کے ان پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے جنھوں نے ہندوستانی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ "اردو دنیا" میں اس کا ترجمہ "ہندوستانی تاریخ کے اہم موڑ" کے نام سے قسط وار شائع کیا جارہا ہے۔

کر دیا۔ 1740 میں باجی راؤ کے انتقال تک سیاسی مرکز ثقل، مغل دارالحکومت دہلی سے پونا میں ساہو کے بیٹے شواجی کے دربار میں منتقل ہو گیا تھا۔

باجی راؤ کا بیٹا، بالاجی باجی راؤ اپنے باپ کی طرح دانش مند نہیں تھا، لیکن اس نے پیشوا اقتدار کو برقرار رکھا۔ وہ اپنے چچازاد بھائی سداشوراؤ کے مشوروں پر انحصار کرتا تھا جس کی مدد سے اس نے ہمالیہ اور سندھ ندی سے لے کر جنوبی سمندروں تک ایک سلطنت قائم کر دی تھی۔ 1758 تک مراٹھوں نے پورے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ اٹک کے قلعے پر مراٹھا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ان کے جانشینوں نے مزید کامیابیاں حاصل کیں۔ ان میں سے ایک ناگپور کے بھونسلے نے بنگال کے مغل وائسرائے، علی وردی خاں کو مجبور کیا کہ وہ مراٹھوں کو نہ صرف یہ کہ اڑیسہ کا مکمل اختیار دیں بلکہ بنگال اور بہار میں چوتھ وصول کرنے کا حق بھی حاصل کیا۔ اگلے کچھ ہی برسوں میں یہ اختیار شمالی ہندوستان کی بھی ریاستوں میں نافذ کر دیا گیا۔

مراٹھوں کی پنجاب فتح کے نتیجے میں بعض نئی دشواریاں پیدا ہوئیں۔ احمد شاہ ابدالی نے اسے اپنی توہین سمجھا۔ وہ نادر شاہ کی فوج کا ایک سپہ سالار تھا جو 1747 میں کابل کا خود مختار حکمراں بن گیا تھا اور شمالی ہند کے زرخیز علاقوں پر اپنی حریص نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ اگلے ہی سال اس نے لاہور کو فتح کیا اور دہلی کی جانب پیش قدمی کی، لیکن اسے شکست ہوئی اور اسے کابل واپس لوٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔ تین برسوں کے بعد 1752 میں اس نے تیسری بار پنجاب پر حملہ کیا اور دہلی کی طرف بڑھا۔ اس بار اس وقت کے مغل حکمراں کے پاؤں شل ہو گئے اور اپنے وزیر عمادالملک کے مشورے پر اس نے پنجاب اور ملتان کو احمد شاہ ابدالی کو سونپ دیا۔

1753 میں میر منو کی موت کے بعد پنجاب میں حالات مزید ابتر ہو گئے۔ وہاں پر طوائف الملوکی عام ہو گئی۔ میر منو کی بیوہ، مغلانی بیگم نے ابدالی سے ریاست کے اس حصے میں نظم و ضبط برقرار کرنے کی درخواست کی۔ اس سے قبل کہ ابدالی مغلانی بیگم کی درخواست پر کوئی اقدام کرتا، دہلی کا مغل دربار حرکت میں آ گیا، اور وہاں پر اپنے گورنر اور نائب گورنر مقرر کر دیے۔ ابدالی اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح 1757 میں فوری طور پر اس نے اپنے ایک سپہ سالار کو لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا۔ وہ بذات خود آگے بڑھا۔ اس بار اس نے پیش رفت کی اور دہلی پر تسلط قائم کر لیا۔ دہلی کا بادشاہ ایک غیر ملکی حملہ آور کے ہاتھوں قیدی بن گیا تھا۔ مغل دربار نے جاٹوں، مراٹھوں اور راجپوتوں سے درخواستیں کیں کہ وہ افغان سردار سے مقابلہ کرنے میں مدد کریں لیکن وہ خود اپنی آپسی لڑائیوں میں مصروف تھے۔ متھرا اور دہلی سے کوچ کرنے سے قبل وہ سولہ سالہ شہزادی کو اپنی زوجیت میں لے کر ساتھ لے گیا اور روہیلا سردار نجیب کو مغل دربار میں اپنا کار پرداز مقرر کیا۔ جیسے ہی ابدالی نے افغانستان کوچ کیا، مغل دربار اپنی سابقہ صورت میں منتقل ہو گیا۔

مراٹھا ایک بار پھر ابھر کر آئے اور انھوں نے غاصبوں سے جاگیریں، قلعے اور عہدے واپس لیے۔ اپریل 1758 کو انھوں نے پیش قدمی کی، لاہور پر قبضہ کیا اور ادینا بیگ کو گورنر کے عہدے پر فائز کیا۔ مغل دربار میں بھی انھوں نے مغل وزیر عماد کی درخواست پر فوری عمل کیا اور میر بخشی نجیب الدولہ کو نکال باہر کیا جو حالانکہ عہدے میں دوسرے نمبر پر تھا لیکن تمام اختیارات اسی کے ہاتھوں میں تھے۔ نجیب دہلی سے باہر نکل کر سہارنپور چلا گیا جو کہ اس کی جاگیر تھی۔ مراٹھا اس کو پسپا کرنے کے لیے جھپٹے اور وہ گنگا کے مغربی کنارے پر شکرا تال میں ایک دفاعی جنگ میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے چار مہینوں تک مراٹھوں کے محاصرے کو روکے رکھا یہاں تک کہ اس نے اپنے ہمسایہ اودھ کے نواب کی فوجوں کی مدد حاصل کی اور احمد شاہ ابدالی نے پہنچ کر اس کے اوپر کے دباؤ کو کم کیا۔ ابدالی، دراصل، بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور پورے پنجاب پر دوبارا اپنا تسلط قائم کر لیا اور پھر دہلی کی جانب پیش قدمی کی۔ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے مراٹھوں اور عماد کو شکرا تال میں نجیب کے محاصرے کو ختم کرنا پڑا۔

مراٹھوں نے احمد شاہ ابدالی کی پیش قدمی کو روکنے کی کوشش کی، لیکن انھیں دہلی کے قریب تھانیسر میں شکست حاصل ہوئی۔ شمالی ہندوستان کے بدلتے ہوئے رخ کی بنا پر پونہ میں بھی تشویش ہوئی اور پیشوا کو مجبور ہو کر 29,000 مراٹھا فوج اور 8000 سپاہیوں کو ابراہیم خاں گاردی اور سداشو راؤ بھاؤ کی ماتحتی میں مغل بادشاہ کی مدد کے لیے بھیجنا پڑا۔

اس موقع پر ایک جانب احمد شاہ ابدالی اور اس کے ساتھ نجیب کے درمیان اور دوسری طرف مراٹھوں اور مغل دربار کے درمیان زبردست سودے بازی ہوئی۔ بعض طاقتور سرداروں نے اپنی حفاظت کی غرض سے غیر جانبدار رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اودھ کے نواب نے، جس کے باپ کے ہاتھوں 1748 میں ابدالی کو شکست ہوئی تھی، مراٹھوں کی مدد کرنے کا وعدہ کیا جس کے بدلے میں ان سے خود کو مغل وزیر بنانے اور علی گوہر کو بادشاہ بنانے کا عہد کیا۔ جبکہ یہ بات چیت جاری ہی تھی کہ نجیب نے مراٹھوں کو پیچھے ڈھکیلا اور اودھ کی سرحد کے علاقوں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ نواب اودھ کے اوپر دباؤ بڑھ گیا جو پہلے ہی جان چکا تھا کہ احمد شاہ ابدالی علی گڑھ میں اپنی فوجوں کے ساتھ پڑاؤ ڈال رہا ہے۔

جب نواب نے ہچکچاہٹ دکھائی تو احمد شاہ ابدالی نے اس کے سامنے وہی شرائط رکھیں جیسا کہ اس نے مراٹھوں سے مانگ کی تھی۔ لیکن نواب

اودھ راضی نہیں ہوا۔ مراٹھوں نے نواب کی ماں کے ذریعے اور ابدالی نے بیوہ رانی ملکۂ زمانی کے ذریعے نواب پر دباؤ ڈلوایا لیکن یہ بے اثر ثابت ہوا۔ کیونکہ نواب جانتا تھا کہ ابدالی تو کابل واپس لوٹ جائے گا اور مراٹھوں کی کامیابی سے مکمل طور پر ان کا اقتدار قائم ہوجائے گا۔ اس لیے، نواب اودھ اپنی غیر جانبداری پر ہی قائم رہا۔ آدھی رات کو نجیب اس سے ملاقات کے لیے آیا۔ جب سبھی دلائل ناکام ہوگئے تو اس نے مذہبی جذبات سے کام لیا۔ چونکہ نواب ایک شیعہ مسلمان تھا، وہ سنّی احمد شاہ ابدالی کی زبان پر بہت زیادہ اعتماد نہیں کرتا تھا۔

اب نجیب نے احمد شاہ ابدالی سے وزارت کا اعزاز نواب کو عطا کرنے کا مشورہ دیا۔ اودھ میں سداشو راؤ بھاؤ کے وکیل نے اس کی مخالفت کی اور نواب نے اس سے کہا کہ احمد شاہ ابدالی کے خیمے میں اس کی موجودگی مراٹھوں کے لیے معاون ہوگی اور یہ کہ وہ افغانوں کے درمیان مصالحت کی کوشش کرے گا جو پنجاب کو اپنی ملکیت میں دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسری جانب مراٹھا بھی اسے اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں۔

مصالحت کسی بھی طرح سے نجیب یا عماد یا اس کے نئے ساتھی جاٹ سردار سورج مل کے موافق نہیں تھی۔ وہ سبھی مغل دربار میں اپنی نمایاں حیثیت حاصل کرنے کے خواہش مند تھے، ایسی حیثیت جو مراٹھوں اور افغان کے درمیان مصالحت کے ذریعے خطرے میں پڑ جاتی۔ اس طرح سے ان کا طرز عمل اس میں رخنہ ڈالنے والا تھا۔

غیر جانبداروں کو متاثر کرنے کی غرض سے 2اگست 1766 میں مراٹھوں نے دہلی کے اندر نقل و حرکت شروع کی۔ وہاں پر آدمیوں کے کھانے اور جانوروں کے چارے کی قلت تھی۔ رسد نہایت مختصر تھی۔ پیشوا کے پاس فنڈ نہیں تھا اور بدترین صورتحال کی وجہ سے محصول وصول کرنا بے حد دشوار تھا۔ دہلی کے حالات نے سدا شو راؤ بھاؤ کو دہلی سے باہر جانے پر مجبور کیا۔ اس نے مغل فوج کو خوراک فراہم کرنے کے لیے خزانے اور دوسرے ذرائع سے روپے حاصل کیے۔

آئندہ کچھ ہی مہینوں کے اندر افغان مہم جو سے مقابلہ کرنے کے لیے اسے پانی پت میں جاکر پڑاؤ ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ بہت خطرناک ثابت ہوا کیونکہ مراٹھا فوج میں اب شواجی کے عہد کی طاقت نہیں رہ گئی تھی۔ اب یہ مغل فوجوں کے ڈھنگ کی ایک شاہانہ فوج تھی جس کے پاس وافر مقدار میں سامان آرائش بشمول ریشمی خیمے اور حرم موجود تھے۔ اس کے برعکس ابدالی کی فوج بہت ہی سبک قسم کی تھی۔ اس نے پانی پت کو تمام ذرائع ابلاغ سے کاٹ دیا۔

جب شجاع نے اسے ایک معقول جزیہ لے کر کابل واپس لوٹ جانے کی پیش کش کی تو ابدالی نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ ایک کو چھوڑ کر سبھی امن چاہتے تھے۔ یہ نجیب تھا جس نے اسلام کے نام پر ابدالی کو خبردار کیا کہ مراٹھوں کی نوعیت ہندوستانی باغ میں ایک کانٹے کی طرح ہے۔ اگر اسے جڑ سے نہیں اکھاڑا گیا تو وہ دوبارا اس کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔

امن کے لیے ہونے والی بات چیت دو مہینوں تک جاری رہی۔ مراٹھا فوجیوں کی حالت ناقابل برداشت ہوگئی اور ان میں فاقہ کشی کی نوبت آگئی۔ 13 جنوری 1761 کو سداشوراؤ بھاؤ نے شجاع کو ایک رقعہ لکھا اور کہا" پانی اب میرے سر کے اوپر جاچکا ہے۔ جو کچھ بھی ہوسکتا ہے کرو ورنہ فوری طور سے مجھے مطلع کرو۔ اس کے بعد تحریر کے لیے وقت نہیں ملے گا۔"

اس نے رقعہ بھیجا، یہ محسوس کیے بغیر کہ وہ دشمن کو خبردار کر رہا ہے۔ شجاع نے ابدالی کو آنے والے خطرے سے آگاہ کیا اور ابدالی نے جسے پہلے ہی وارننگ مل گئی تھی، لڑائی کا حکم دے دیا۔ طلوع آفتاب سے لے کر دوپہر تین بجے تک دونوں فوجوں میں ڈٹ کر مقابلہ ہوا۔

فرانسیسی جنرل ایم بسی کے ذریعے تربیت یافتہ، ابراہیم خاں گاردی کی ماتحتی میں مراٹھا توپ خانہ 55000 سوار فوجوں، 15000 پیادہ دستوں اور 15000 پنڈاریوں کی مدد کے لیے موجود تھا۔ جب کہ اس کے برعکس ابدالی کے پاس 40,000 توپیں اور 35,000 پیدل فوج تھی اور اس کے علاوہ روہیلا فوجیں جو ابدالی کے دائیں پہلو میں موجود تھیں۔ مراٹھوں نے داہنے دستے کے ساتھ ساتھ افغانوں کے مرکزی دستے پر حملہ کیا۔ شروعات میں لڑائی میں مراٹھوں کی بالادستی نظر آرہی تھی۔ لڑائی اپنے شباب پر پہنچ گئی۔ جلد ہی ہر طرف قہر برپا ہوگیا۔ دھول اور دھوئیں کے مرغولوں میں آسمان گم ہوگیا۔ تبھی اچانک قسمت نے پلٹا کھایا۔ مراٹھا سپہ سالار سداشوراؤ بھاؤ میدان جنگ میں مارا گیا۔ پیشوا کے بیٹے وشواس راؤ نے بھی منہ کی کھائی۔ مراٹھا سردار جیسے ہولکر اور سندھیا کی فوجیں جنھوں نے مراٹھوں کے دستے تیار کیے تھے میدان سے غائب تھے نتیجتاً مراٹھا فوج کی شکست ہوگئی۔ میدان جنگ میں 28,000 لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ پیشوا دلبرداشتہ ہوگیا تھا۔ اس نے مدد کے لیے کچھ مراٹھا فوجوں کو منظم کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

□□□

تحریر: امروز
ترجمہ: فیروز عالم

الوداع......امرتا پریتم

امرتا کہیں نہیں گئی ہے۔ وہ میرے پاس ہی ہے۔ جسم بے شک نہیں ہے۔ پہلے کی طرح روز یہ سوچ کر گھر لوٹتا ہوں کہ وہ انتظار کررہی ہوگی۔ گھر میں اس کی موجودگی کا احساس اب بھی ہے۔ گذشتہ چالیس سال یعنی 1964 سے امرتا کے ساتھ حوض خاص والے گھر میں ہوں، تب سے آج تک ساتھ ساتھ رہنے کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔ حالانکہ ملنے جلنے کا دور 1964 سے کچھ عرصہ پہلے سے ہی شروع ہوگیا تھا۔ امرتا سے پہلی ملاقات 1957 میں اس کی کتاب ''آخری خط'' (افسانوی مجموعہ) کا سرورق بنانے کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ ''آخری خط'' ہماری دوستی کی شروعات ثابت ہوا۔ وہ مغربی پٹیل نگر میں رہتی تھی اور میں جنوبی پٹیل نگر میں۔ میں آصف علی روڈ سے شائع ہونے والے رسالے ''شمع'' کی کہانیوں کے لیے السٹریشن بنایا کرتا تھا۔ میرے کام کے بارے میں امرتا کو میرے ایک ہم جماعت سے پتہ چلا تھا۔ اس نے مجھے اپنے گھر ''آخری خط'' کا سرورق بنانے کے لیے بلایا تھا۔ اس کے بعد جو رابطہ قائم ہوا وہ رفتہ رفتہ میل جول میں تبدیل ہوا اور دوستی گہری ہوتی گئی۔ کتاب کے سرورق کا جو ڈیزائن میں نے تیار کیا تھا وہ امرتا کو پسند آیا تھا۔ امرتا مجھ سے سات سال بڑی تھی لیکن میرے اور اس کے خیالات میں بڑی ہم آہنگی تھی ساتھ ہی کئی باتوں میں اختلاف بھی تھا۔ خیالات میں ہم آہنگی کے باوجود اگر اس سے محبت نہیں ہوتی تو دوستی پھیکی پڑ جاتی اور تب شاید ہم دونوں الگ ہوجاتے۔ میں اب تک اپنی ہی کمائی خرچ کرتا ہوں، اسی میں مجھے سکھ ملتا ہے۔ دوسروں کی کمائی میں نہیں، والدین کی جائیداد میں بھی نہیں۔ امرتا اور میرے مزاج میں یہی یکسانیت ہے۔ صرف باورچی خانہ اور گھر مشترکہ طور پر چلاتے ہیں، دیگر ضرورتیں اپنی مرضی سے جیسا جی چاہے اپنی کمائی سے پوری کرتے ہیں۔

امرتا کی شادی بچپن میں ہی کردی گئی تھی۔ والدین نے بغیر سوچے سمجھے صرف گھر اور تعلیم یافتہ لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کردی تھی۔ لیکن شوہر کے ساتھ وہ زیادہ دن نہیں رہ پائی۔ ذہنی طور پر وہ ہمیشہ اپنے شوہر سے جدا ہی رہی۔ وہ الگ رہنا چاہتی تھی۔ اپنا مسئلہ لے کر وہ ماہر نفسیات کے پاس گئی جس نے اسے مشورہ دیا کہ موجودہ سماج میں تنہا رہنا مناسب نہیں ہوگا۔ صحیح آدمی ملنے پر الگ ہوجانا۔ صحیح وقت آیا اور ''جدا'' رہنے والی امرتا شوہر سے الگ ہوگئی۔ اس نے اپنے شوہر سے کہہ دیا کہ میں اب الگ رہوں گی۔ وہ مکان امرتا کا تھا اس میں شوہر کا حصہ نہیں تھا اس لیے اس کا شوہر وہاں سے چلا گیا۔ جہاں تک پریتم (اس کے شوہر کا نام) کے نام کے ساتھ وابستگی کا سوال ہے وہ کوئی خاص معنی نہیں رکھتا کیوں کہ پریتم کا مطلب پیارا ہوتا ہے۔

امرتا سے میری دوستی تقریباً چالیس سال تک قائم رہی۔ کچھ خاص نہ ہونا ہی ہماری دوستی کی خصوصیت تھی۔ میں تصویریں بناتا اور وہ شاعری کرتی تھی۔ دونوں کا گھر ایک ہی تھا لیکن کمرے الگ الگ تھے۔ وہ مکان کے پچھلے سرے پر اپنے کمرے میں نظم، کہانی اور ناول لکھنے میں مصروف رہتی جبکہ میں دوسرے سرے پر اپنے کمرے میں برش، رنگوں اور کینوس کے ساتھ۔ صرف باورچی خانے میں چائے اور کھانے پر ملاقات ہوتی تھی یا دونوں کے کسی جاننے والے دوست کی آمد پر۔ وہ کوئی نظم لکھتی تو مجھے سنانے کے لیے بلاتی۔ میں کوئی پینٹنگ کرتا یا پھر کوئی پسندیدہ گانا سنتا تو اسے بلاتا۔ جو فلم مجھے پسند آتی اور یہ لگتا کہ یہ امرتا کو بھی پسند آئے گی تو اسے بھی فلم دکھانے لے جاتا۔ وہ ایک بجے رات کے بعد اپنی نظم لکھ رہی ہوتی تو میں اپنے کمرے میں سو رہا ہوتا تھا۔ نظم اس کے خواب میں پہلے ہی آجاتی تھی، اٹھ کر اسے لکھ ڈالتی تھی، نظر ثانی نہیں کرتی تھی۔ کینوس کے ضمن میں امرتا کو Concieve کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کا چہرہ جتنا حسین تھا، اتنا ہی مشکل تھا، بلکہ مشکل زیادہ تھا۔ چہرے کے رنگ اتنی تیزی سے بدلتے تھے کہ اس چہرے کو مکمل ریکارڈ کرنا بہت مشکل کام تھا۔ اس کی تصویریں اور اسکیچ اکثر بہت سخت ہوتے تھے۔ وہ خود بھی انھیں دیکھ کر دہل جاتی تھی اور بیساختہ اس کے منہ سے نکل جاتا تھا

''"It is horrible, It is not me...... ......" میری پینٹنگ دیکھ کر ایک بار اس نے کہا تھا کہ تم نے کبھی "Women with Mind" پینٹ کی ہے۔ یہ بات 1959 کی ہے۔ میرے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں تھا کیوں کہ سچ میں نے اس طرح کی پینٹنگ نہیں بنائی تھی۔ اس وقت اور اس کے پہلے میری اور دوسروں کی پینٹنگ صرف عورت کے کسے ہوئے بدن پر فوکس کرتی تھی اس کی ذہنی خوبصورتی کو نہیں جبکہ عورت محض جسم نہیں ہے۔ امرتا کے مشورے پر میں نے "Women with Mind" کو ذہن میں رکھ کر پینٹنگ کی جسے تکمیل تک پہنچانے میں پانچ چھ سال لگ گئے۔

امرتا کی خوبی یہ تھی کہ وہ کسی طرح کے تکلف میں یقین نہیں رکھتی تھی۔ نہ دوستوں کی دعوت میں جاتی تھی نہ دعوت دیتی تھی۔ کوئی دوست آجائے تو ہم اس کے لیے الگ سے کچھ نہیں بناتے تھے، اپنے کھانے میں ہی اسے شامل کر لیتے تھے۔ ایک رات ہم پیدل ہی اسٹیشن سے گھر (مغربی پٹیل نگر) کو چل دیے تھے۔ چاند کو دیکھتے ہوئے ایک دوسرے میں مگن ہم گھر پہنچے۔ کافی رات ہوگئی تھی، سب کھانا کھا چکے تھے، امرتا کا کھانا رکھا تھا۔ امرتا نے ایک پلیٹ اور منگوائی۔ اس کے لیے صرف دو روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ امرتا نے ایک روٹی خود لے لی اور ایک میری تھالی میں رکھ دی، کھاتے کھاتے امرتا نے دھیرے سے آدھی روٹی اور میری پلیٹ میں رکھ دی۔ وہ آدھی روٹی مجھے آج بھی یاد ہے، وہ روٹی ہی آدھی تھی لیکن اس رات چاند پورا تھا۔

ہم دونوں کو تنہائی بہت پسند رہی۔ میں اور امرتا دن بھر گھر پر ہی رہتے تھے لیکن زیادہ تر اپنے اپنے کمروں میں، ہمارے کمروں کے دروازے کھلے ہی رہتے۔ کھلے دروازوں والے کمروں سے ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا لیکن کوئی دخل نہیں۔ امرتا جب لکھتی تھی تو میں اس کی خلوت کا خیال رکھتا تھا۔ بیچ بیچ میں، میں چائے کی پیالی آہستہ سے اس کے پاس رکھ آتا تھا۔ کھانا مل کر بناتے تھے۔ نہ کھانا بنانے کے لیے معاون رکھنا، نہ گاڑی چلانے کے لیے ڈرائیور۔ ہم دونوں نے ہمیشہ خوش رہنا سیکھا۔ اپنی پینٹنگ میں بھی میں کبھی اداسی کی عکاسی نہیں کرتا تھا اور نہ ہی اسے دیواروں پر لٹکا کر دیکھنا چاہتا۔ اداسی کو بار بار دیکھنا اچھا نہیں لگتا، کچھ ویسے ہی جیسے بار بار قبرستان نہیں جایا جاتا۔ میری پینٹنگ کی طرح امرتا نے بھی اپنی ادبی تخلیقات میں زندگی کی عکاسی کی۔ وہ صرف اداسی ہی نہیں، خوشی اور غم دونوں کو یکساں پیش کرتی تھی۔ وہ نسائی ادب یا کسی اور ازم میں شامل نہیں ہوتی تھی۔ نہ وہ کسی نظریے سے وابستہ تھی نہ ہی کسی سیاسی جماعت سے۔ وہ ان سب سے آزاد رہ کر لکھنا چاہتی تھی۔ جہاں تک اس کی ادبی تخلیقات کا سوال ہے میری نظر میں وہ نہایت خوبصورت اور دلکش و دلآویز ہے۔

جس دن سے وہ بیمار پڑی تب سے میں اس کا ساتھ زیادہ دینے لگا تھا۔ وہ ساتھ رہنے اور بیٹھنے کے لیے کہتی تھی، دوسروں کی مدد نہیں لینا چاہتی تھی۔ اس کا انتقال موت نہیں بلکہ الوداع ہے۔ مرنے سے پہلے یعنی بیمار پڑنے پر اس نے جو آخری نظم لکھی اس میں ''الوداع'' ہی کہا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی پوجا نہیں کی اور نہ ہی میں نے۔ وہ چھوٹی چھوٹی مورتیاں خریدتی تھی، سجاتی تھی، لیکن پوجتی نہیں تھی بلکہ انھیں پیار کرتی تھی۔ ''میں تمھیں پھر ملوں گی'' نظم کے ساتھ امرتا کی ادبی زندگی پوری ہوگئی تھی۔

میں تمھیں پھر ملوں گی
کہاں؟ کس طرح؟ نہیں معلوم
شاید تیرے تخیل کی چنگاری بن کر
ترے کینوس پر اتروں گی
یا شاید ترے کینوس کے اوپر
ایک پراسرار لکیر بن کر
خاموش تمھیں دیکھتی رہوں گی......

(بشکریہ ''ہندوستان'' نئی دہلی، 5 نومبر 2005) □□□

بدھ کی کہانیاں

مصنف: اچلا کھنہ

بودھ مذہب کے بانی مہاتما بدھ ایک عظیم انسان تھے جنھوں نے اپنی زندگی کو عملی نمونہ بنا کر عوام کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے ستیہ اور اہنسا کے اصولوں پر بے حد زور دیا اور ہر ذی روح کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے ساتھ پیش آنے کا درس دیا۔ کہانیوں کی یہ کتاب گوتم بدھ کی زندگی کے واقعات سے ترتیب دی گئی ہے۔

صفحات: 80، قیمت: -/65 روپے

تینالی رمن کی کہانیاں

مصنف: سی. ایل. ایل. جیا پردا، مترجم: نامی انصاری

شمالی ہند میں جس طرح بیربل کی حاضر جوابی اور ذہانت کی کہانیاں مشہور ہیں اسی طرح جنوبی ہند میں تینالی رمن کی کہانیاں زباں زد عام ہیں۔ وہ اپنی غیر معمولی ظرافت، عقل مندی، رحم دلی اور خوش تدبیری کے باعث وجے نگر کے راجا کرشن دیو رائے کا درباری شاعر بن گیا تھا اور کئی موقعوں پر اس نے راجا کی مشکلیں آسان کیں۔ اس کتاب میں ایسے ہی کچھ دلچسپ واقعات درج کیے گئے ہیں۔

صفحات: 72، قیمت: -/60 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

کنور نارائن

روشنی گویا شفاف اندھیرے میں نہائی ہوئی

نرمل کا لکھا کچھ پڑھتے وقت میں نے اکثر پایا ہے کہ میں انجانے ہی اسے بہت دھیمی رفتار سے پڑھنے لگ گیا ہوں— لگ بھگ اس نثر کو سہلاتے ہوئے، خرگوش (نرمل کی پسندیدہ تشبیہ) کے روئیں کی طرح، ملائم اس کی جلد کو۔ اس نثر کو، لگتا ہے، تیزی سے پڑھنا یا پڑھ جانا، اس خاص لے کے ساتھ ناانصافی ہوگی جو نرمل کی تخلیقی نثر کی انفرادیت ہے، جسے مانو وہ خود نازک چیز کی طرح اتنے احتیاط سے لے کر چلتے ہیں کہ کہیں وہ کسی سخت چیز سے ٹکرا، کھردری چیز سے رگڑ کھا کر ٹوٹ اور بکھر نہ جائے۔

نرمل کی کہانیوں میں آپسی رشتوں کی اندرونی چھبیں ہیں، گانٹھیں ہیں، تو تنیں ہیں، کشمکش ہیں، درد ہیں، لیکن چیزوں کے ساتھ رشتوں کی دہشت بہت کم ہے۔

ایک پرانے درد کا ٹیپ، جس کا رشتہ کسی دوسری زندگی سے ہے---- چیزیں اور آدمی کتنے الگ ہیں!

ان کی کہانیوں میں جنون نہیں ہے، نہ طوفان ہے، ایک اداس اور مہذب قسم کی فکر ہے، تجربے کے مقابلے احساس کے سب سے زیادہ چوٹ کھائے، یا چوٹ کھاتے حصوں کو احتیاط اور تامل سے کھول کر دکھاتی ہوئی۔ اس تکلیف پر فکر کی ان کی اپنی سلوٹیں اور 'میٹافزکس' ہے جس کی جانی پہچانی اصطلاحات کو ہم 'کوے اور کالا پانی' میں پھر ایک بار اپنے پورے وقار اور افتخار میں برقرار پاتے ہیں۔

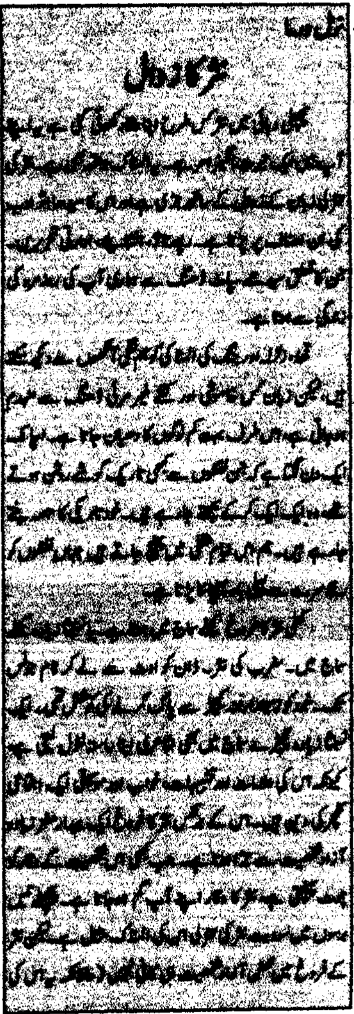

وہ لمحہ بھر دھری پر ٹھٹھک گیا، میں چلتا ہوں، اس نے کہا۔ پتہ نہیں، یہ بات اس نے کس سے کہی تھی، لیکن جہاں وہ بیٹھی تھی، وہاں سے کوئی آواز نہیں آئی۔ وہاں اتنی ہی گھنی چُپّی تھی، جتنی باہر اندھیرے میں، جہاں وہ جارہا تھا۔

(ایک دن کا مہمان)

ہم چینل پار کررہے ہیں...... نیچے دیکھا، کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا— نہ سمندر، نہ لائٹ ہاؤس، صرف اندھیرا، اندھیرے میں بہتا ہوا اندھیرا...... پھر کچھ بھی نہیں۔ اور تب نیچے اندھیرے میں جھانکتے ہوئے اسے خیال آیا کہ وہ چینل جو نیچے کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا، اصل میں کہیں اندر ہے...... اس کی ایک زندگی سے دوسری زندگی تک پھیلا ہوا ہے، جسے وہ ہمیشہ پار کرتا رہے گا، کبھی ادھر، کبھی ادھر، کہیں کا بھی نہیں، نہ کہیں سے آتا ہوا، نہ کہیں پہنچتا ہوا......

(کوے اور کالا پانی، صفحہ 187)

'پاپا، کیا تم اب بھی اپنے آپ سے بولتے ہو؟'

'ہاں' لیکن اب مجھے کوئی نہیں

سنتا......

کوے اور کالا پانی، مجموعہ کی سب سے لمبی کہانی ہے اور نرمل کی کہانیوں کے 'موڈ' کو اس کی پوری گہرائی میں پکڑتی ہوئی۔ اور بھی کچھ ہے جو نرمل کی پچھلی کہانیوں سے الگ ہے۔

باہر دھند میں ٹھٹھرتے ہوئے وہ دنیا کتنی بیگانی لگتی ہے! اچانک ایک رِریاتے سے ڈرنے مجھے پکڑ لیا: اگر کوئی مجھے اچانک اس خوبصورت اور محفوظ دنیا سے باہر پھینک دے تو میرا کیا ہوگا...... میں اس ٹڈے کی طرح اندھیرے میں چکر لگاؤں گا جسے ایک انگلی سے پکڑ کر ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے باہر پھینک دیا جاتا ہے...... اور جو دوبارہ کبھی اندر کا راستہ نہیں ڈھونڈ پاتا......

(کوے او رکالا پانی، صفحہ 149)

نرل کی کہانیوں کو پڑھتے وقت ایک خیال ذہن میں بار بار آتا ہے...... ان میں ایسا کچھ نہیں ہوتا محسوس ہوتا جو پچھلے کچھ ہوئے، یا کیے، کو خارج کر کے آگے بڑھتا ہو۔ ان کی کہانیوں میں ماضی کی جتنی پراثر موجودگی ہوتی ہے اتنی حال، یا مستقبل کی نہیں۔ کہیں کہیں تو ایسا لگتا ہے گویا حال کو اس طرح الٹ دیا گیا ہے کہ وہ ماضی کے لیے یک بیک ڈراپ کا کام کر رہا ہے۔ اسی لیے شاید ان کے حال کے بھی تذکروں میں 'یادوں کا' دھند لکا سا رہتا ہے۔ روشنی بھی گویا ایک شفاف اندھیرے میں نہائی ہوئی، جسے ہم نرل کی کہانیوں کا خاص رنگ کہہ سکتے ہیں۔ یہ رنگ کافکا کی کہانیوں کے ماحول کی یاد دلاتا ہے اور یہ ناممکن نہیں کہ نرل کی کہانیوں میں وہ وہیں سے آیا ہو جہاں سے کافکا میں۔ پراہیہ شہر (چیکوسلواکیہ) کے گرجے، عمارتیں، سڑکیں۔ جگہ جگہ اسی رنگ کا احساس جگاتے ہیں۔ لیکن یہ نرل کی کہانیوں کا داخلی رنگ نہیں ہے، جیسا کہ کافکا میں وہ ہے۔ وہ نرل کی کہانیوں کے دامن کا رنگ ہے۔ اندر کہیں نرل کے تحت الشعور میں خالص ہندوستانی کلچر کی گہری چھاپ ہے۔ سب سے زیادہ، چیزوں کو لے کر ان کی علیحدگی، بلکہ بیزاری میں۔

نرل کی کہانیوں کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے ان کو معمول سے زیادہ موقع دینا پڑتا ہے۔ ان سے قربت بنانی اور پھر بڑھانی ہوتی ہے۔ ان کے لیے ہمارے پاس پہلے ہی سے کوئی تیاری نہیں ہوتی، یا اتنی کم اور الگ طرح کی ہوتی ہے کہ پہلے تعارف میں، ممکن ہے، ہم نرل کی کہانیوں کے اس حقیقی مفہوم تک ہی نہ پہنچ پائیں، جو سچائی کی ہو بہو عکاسی سے نہیں، اس کے، اور خود کے بھی لگ بھگ غیر جانبدار جائزے سے نکلتا ہے۔ کہانی کے روایتی کہانی پن کو لگ بھگ خارج کرتا ہوا۔ نرل کی کہانیاں مادی سچ کی نیرنگیوں اور بڑی زمین کو نہیں سمیٹتیں، بلکہ سچ کے حقیقی مفہوم کو تجربے کی ایک محدود دنیا میں پانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اسی لیے شاید نرل کی کہانیوں میں نیرنگیوں کی بہ نسبت ایک خاص اسلوب اور 'موڈ' کے میلان کی روشن تاریخ ہے۔ 'کوے اور کالا پانی' اس سمت میں ایک اہم پیش رفت ہے۔

(بشکریہ "اردو نامہ" پٹنہ، شمارہ 226، 30 اکتوبر 2005)

□□□

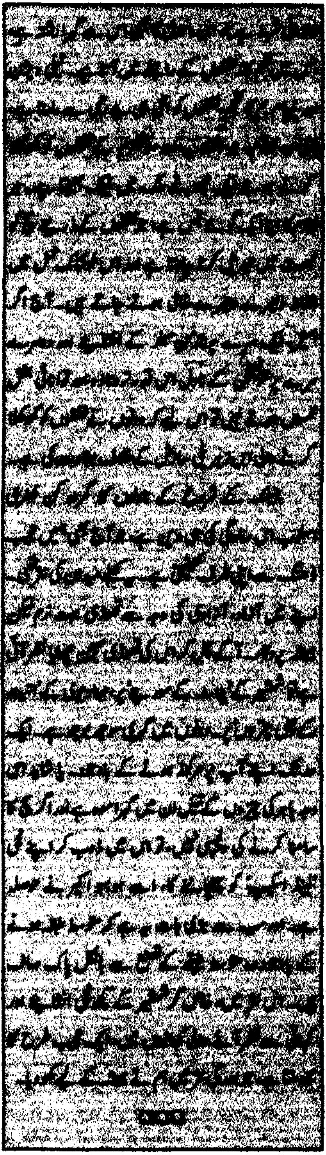

مرزا محمد زماں آزردہ

ہماری مطبوعات

"مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے" سے اقتباس

مرزا دبیر کی اردو نثر نگاری

مرزا دبیر نے عصری رواج کے مطابق فارسی نثر کو اظہار کا ذریعہ قرار دیا تھا لیکن انھوں نے عام رواج کے برعکس اردو نثر کو تحقیر کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اسے فارسی کے پہلو بہ پہلو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ انھوں نے اردو نثر میں ایک مستقل تصنیف "ابواب المصائب" یادگار چھوڑی ہے جو کئی اعتبار سے اردو نثر کی تاریخ میں اہمیت کی مالک ہے اور لکھنؤ کے نثری دبستان کے مطالعے میں ناگزیر ہے۔(1)

یہ کتاب مطبع یوسفی دہلی سے شائع ہوئی۔ دیباچہ اور ترقیمہ سے 1245ھ (1829) سال تصنیف قرار پاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زیر نظر کتاب اردو نثر کے محققوں اور ناقدوں کی نظروں سے اوجھل تھی کیونکہ اردو نثر کی تاریخ کے اولین دور کے بیان میں "ابواب المصائب" کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کتاب کے متعلق افضل حسین ثابت لکھتے ہیں:

"جناب مرزا اوج صاحب قبلہ سے بر سبیل تذکرہ معلوم ہوا کہ اس کا اصل مسودہ مرزا صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے پس یہ کتاب بالتحقیق ان ہی کی تصنیف پائی جاتی ہے۔"(2)

موجودہ صورت میں دست برد زمانہ کی بنا پر "ابواب المصائب" کا مسودہ خاندان دبیر میں محفوظ نہیں رہ سکا۔ راقم کے استفسار پر ان کے خاندان کے لوگوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

ابواب المصائب پہلی بار مطبع یوسفی دہلی سے شائع ہوئی۔ طبع اول پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ اشاعت اول 168 صفحات 15 سطری مسطر اور ساڑھے آٹھ ان نو پانچ سائز پر مشتمل ہے۔ سرورق پر یہ عبارت درج ہے:

"فلیضحکو قلیلا ولیبکو اکثیرا

الحمد اللہ کہ دریں ایام حزن التیام رسالہ عجائب و غرائب اعنی ابواب المصائب"

اور مصنف کا نام اس طرح درج ہے:

"من تصنیفات شاعر بے عدیل و نظیر مرجع ہر صغیر و کبیر جناب مرزا دبیر بمطبع یوسفی دہلی طبع شد"

کتاب کے آخر میں قطعہ تاریخ تصنیف درج ہے۔ ملاحظہ ہو:

اے زہے ایں کتاب حزن اثر   کہ مزین بنام آل عباست
در معانی و لفظ ہر ورقش   مختصر خون سید الشہداست
سطر سطرش بجلوہ تاثیر   مدّ آہ جناب خیر نساست
ہست عاری عبارت از اغراق   چوں الف ہست حرف حرف راست
در کتاب زمانہ ایں اوراق   یادگار دبیر بے سر و پاست
چوں بلطف ائمہ گشت تمام   اے ہمیں لطف خضر منزل ماست
غور کردم بسال تالیفش   کہ ز آئین فرقہ شعر است
ناگہاں فوج فوج آمدہ عقل   از چپ و راست داد مژدۂ راست
گفت ہاتف کہ سال تاریخش   مصحف طاق چشم اہل عزاست"(3)

1245ھ (1829)

اس کتاب میں مصنف نے منظوم دعائیہ کے بعد خاتمہ تحریر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب صرف ایک ہفتے کی مدت میں تصنیف ہوئی۔ لکھتے ہیں:

"بخدائے لایزال کہ بخلط حواس اور تردد بے قیاس من تعجیل تمام اور بعجلت الکلام مدت یک ہفتہ میں اس خود غلط نے یہ اوراق سفید سیاہ کیے ہیں اور اس زمانے میں بھی اکثر اکتساب ثواب مجلس عزا میں اور تحصیل سعادت ملازمت احباء میں حاضر اور موجود رہا ہے۔"(4)

اس کی وجہ تصنیف کے بارے میں مرزا دبیر تحریر کرتے ہیں:

"باعث تالیف اور سبب تصنیف یہ ہے کہ درنیولا بتائید غیبی او یا الہام لاریبی بندہ حقیر کثیر التقصیر اعنی دبیر کا یہ عزم بالجزم ہوا کہ ترجمہ سورہ یوسف کا مشتمل بمصائب جناب سید الشہدا علیہ التحیۃ والثنا بطریق تازہ اور بحسن بے اندازہ از روئے تفاسیر معتبرہ اور احادیث معتقدہ کے تعزیہ داران جناب ابا عبداللہ الحسین علیہ السلام کے مطالعے کے واسطے زبان اردوئے معلی میں کرے........

●مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی تب و تاب عطا کی اور ایک منفرد لب و لہجے سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہوسکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کی حالاتِ زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلام دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ساتھ اس تشنگی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ 592 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 258 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

برادران مومنین و شیعیان ائمہ معصومین علیہم السلام پر واضح ہو کہ بنا تالیف اس کتاب ابواب المصائب کی مقرر کی گئی کیفیت نزول سورہ یوسف علیہ السلام پر اور مطابقت مصائب یوسف آل عبا اعنی جناب سید الشہدا علیہ التحیۃ والثناء و اہل بیت رسولؐ خدا پر اور مصائب حسین ابن علی علیہ السلام۔"(5)

اس طرح ابواب المصائب کی تصنیف کا سبب مرزا دبیر کے نزدیک بتائید غیبی اور بالہام الٰہی ہے۔ انھوں نے سبب تالیف میں یا کسی دوسری جگہ کسی دیگر مماثل تصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اسے ایک آزاد تصنیف کی حیثیت سے پیش کیا ہے لیکن اگر ابواب المصائب کا تقابلی مطالعہ ملا حسین کاشفی کی کتاب "روضۃ الشہدا" سے کیا جائے تو یہ دلچسپ مطابقت نظر آتی ہے کہ روضۃ الشہدا میں بھی "ابواب المصائب" کی طرح سورۂ یوسف کا بیان اور اس سے ربط مصائب سید الشہدا درج ہے۔ روضۃ الشہدا اپنے موضوع کے اعتبار سے انتہائی اہم اور مقبول تصنیف سمجھی جاتی ہے، جسے کاشفی نے 908ھ 1502 میں تصنیف کیا تھا۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق لکھتے ہیں:

"روضۃ الشہدا در ذکر مصائب حضرت امام حسین و یاران او است وی تواں گفت قدیم ترین کتاب است کہ بدیں تفصیل مصیبت ائمہ را ذکر کردہ مدت ہا در مجالس عزا از آں کتاب نقل می کردند و گویا اصطلاح روضہ خوانی، از نام ہمی کتاب آمدہ باشد۔"(6)

یہی ڈاکٹر سید محمد کاظم کا بیان بھی ہے:

"کتاب روضۃ الشہدا بعد با کلمہ روضہ خوانی از نام ایں کتاب گرفتہ شدہ"(7)

گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ ہندوستان میں عزاداری کی ابتدا ایرانی اثرات کے تحت ہوئی تھی اس لیے فطری طور پر مجالس عزا میں بھی روضۃ الشہدا پڑھی جاتی تھی اور ابتدا میں مجالس عزا کے لیے مجالس روضہ خوانی کی اصطلاح بھی مستعمل تھی۔ ہندوستان میں اس کی مقبولیت کا اندازہ حسب ذیل بیان سے کیا جا سکتا ہے:

"روضۃ الشہدا کی مقبولیت کا کچھ اندازہ اس کے نسخوں کی کثرت سے کیا جا سکتا ہے۔ ایران، ہندوستان اور یورپ کے تقریباً تمام اہم کتب خانوں میں اس کے خطی نسخے ملتے ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان اور ایران میں بارہ بار چھپی۔"(8)

ہندوستان میں روضۃ الشہدا کا پہلا منظوم ترجمہ گلبرگہ کے سیوا نے 1092ھ (1681) میں کیا اس کے بعد دکن میں ہی حسن بیگ نے "وسیلۃ النجات" کے نام سے کیا۔ اس کا ایک مخطوطہ سالار جنگ لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ سید علی نے 1182ھ/1768 میں منظوم ترجمہ اور میر ولی خاں مونس نے 1190ھ/1776 میں نثری ترجمہ حادثات کربلا کے نام سے کیا۔ علاوہ بریں سید ہدایت علی واسطی بلگرامی نے 1206ھ/1791 میں ده مجلس کے نام سے اور سید حیدر بخش حیدری نے 1238ھ/1822 میں گلستان شہیداں کے نام سے زبان ریختہ میں ترجمہ کیا۔ روضۃ الشہدا کا ترجمہ اسی نام سے عبیداللہ اور علاء الدین نے مشترکہ طور پر 1287ھ/1870 میں کیا۔ اسی طرح کے متعدد ترجمے ہندوستان کی مختلف لائبریریوں اور ذاتی کتب خانوں میں موجود ہیں جن کی تفصیل پیش کرنا مقصود نہیں۔

اردو کی اولین نثری تصنیف فضل علی فضلی کی کربل کتھا (تصنیف 1145ھ، 33-1732) جو روضۃ الشہدا سے ماخوذ ترجمہ ہے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اسے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اپنے گرانقدر مقدمے کے ساتھ شائع کردیا ہے۔ (9) اس کے علاوہ اردو کے دیگر شاعروں اور مصنفوں نے بھی روضۃ الشہدا سے متاثر ہوکر اسی طرز میں اپنے طور پر کتابیں لکھیں جن میں چند کے نام درج ذیل ہیں:

1	روضۃ الاطہار	از نوازش علی شیدا 1173ھ (1759)
2	روضۃ الشہدا	از میر حسن جعفری تصنیف بعد 1215ھ (1800)
3	ضیاء الابصار	مرزا اکبر علی 1232ھ (1816)
4	بستان شہادت	از سید احمد مدراسی 1254ھ (1838)
5	لمحات الشہادت	از سید سلطان محی الدین بادشاہ قادری 1285ھ (1868)

محفوظ خاطر رہے کہ روضۃ الشہدا کے ترجمے اور اس سے متاثر تصانیف کے ذکر میں کسی فاضل محقق نے مرزا دبیر کی ابواب المصائب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ خود مرزا دبیر نے بھی سبب تالیف بیان کرتے ہوئے روضۃ الشہدا کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ روضۃ الشہدا اس دور میں انتہائی مقبول تصنیف تھی جسے تقریباً تمام مجالس عزا میں پڑھا جاتا تھا اور جس کے نام پر مجالس عزا کو مجالس روضہ خوانی قرار دیا جاتا تھا، اس لیے اس کا خاص طور پر ذکر ضروری نہیں معلوم ہوا۔ ہمارے نزدیک مرزا دبیر کے عصری رجحانات کے پیش نظر ان کا سبب تالیف میں روضۃ الشہدا کا ذکر نہ کرنا کوئی قابل اعتراض بات نہیں کیونکہ یہ بدیہی امر تھا جس سے ہر شخص واقف تھا۔ مرزا دبیر نے روضۃ الشہدا سے متاثر ہوکر ابواب المصائب تصنیف کی جسے دبستان لکھنؤ کے نثری نگارشات کے اولین نقوش میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ذیل میں ابواب المصائب کی تفصیل پیش کی جاتی ہے:

باب اوّل

اس باب میں ابتدائے سورۂ یوسف سے وداع یوسف و یعقوبؑ کے واقعات بیان ہوئے ہیں جو حضرت یوسفؑ کے حسن کی تعریف اور صفات امام حسین علیہ السلام حال ولادت حضرت یوسفؑ اور ولادت امام حسین علیہ السلام برادران یوسف کا حضرت یوسفؑ کے ساتھ سلوک اور امام حسینؑ کے ساتھ کوفیوں کے سلوک پر مشتمل ہے۔

باب دوم

اس باب میں "دنیا" خواہر حضرت یوسفؑ کے خواب، برادران یوسف کی پشیمانی، "دنیا" کی بے قراری، اس چاہ کے پرندوں کی کیفیت جس میں حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے پھینکا تھا۔ حضرت جبرئیلؑ کا اس کنویں میں آنا اور حضرت زینبؑ کی نوحہ وزاری، کوفیوں کی پیماں شکنی، طائروں کا شہادت حسینؑ کی خبر مدینہ اور دوسرے علاقوں میں پہنچانا، خون حسینؑ کے اثر سے یہودی کی بیٹی کا صحت مند ہو جانا اور اس قبیلے کا مسلمان ہونا بیان کیا گیا ہے۔

باب سوم

اس باب میں فرزندان یعقوبؑ کا حضرت یعقوبؑ کو یوسفؑ کا خون آلودہ پیراہن دکھانا۔ حضرت یوسفؑ کے ساتھ سیاہ رنگ غلام کا بے ادبی کرنا۔ حضرت یعقوبؑ کا نوحہ کرنا۔ حضرت جبرئیلؑ کا حضرت یعقوبؑ کو تشفی دینے کے لیے آنا۔ قبر مادر سے حضرت یوسفؑ کا خطاب، ایک شیعہ کا خواب جس میں وہ خون امام حسینؑ سے حضرت فاطمہؑ کو پوشاک آلودہ کیے ماتم کرتے دیکھتا ہے۔ جناب زینبؑ اور امام زین العابدینؑ کا آہ وزاری کرنا۔ اہل بیتؑ پر اشقیاء کے ظلم و تشدد اور قتل گاہ میں اہل بیتؑ کا نوحہ ونالہ بلند کرنا بیان کیا گیا ہے۔

باب چہارم

اس باب میں مالک حضرت یوسفؑ کا حضرت یوسفؑ سے معذرت کرنا۔ حضرت یوسفؑ کا قافلے کے ساتھ مصر میں داخل ہونا اور بعض معجزات حضرت یوسفؑ۔ ساربان کا لاشۂ سید الشہداء کے ساتھ ناروا سلوک۔ حرم محترم رسول خداؐ کا کوفہ میں آنا۔ اہل بیت طاہرینؑ کی شام میں پریشان حالی کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

باب پنجم

اس میں حضرت یعقوبؑ کی دعا حضرت یوسفؑ کی زنداں سے رہائی۔ حضرت یعقوبؑ کا خواب میں حضرت یوسفؑ سے ملاقات کرنا۔ حضرت سکینہؑ کا حال زار، زندانِ شام میں ان کی وفات، حرم اہل بیتؑ کا دربار یزید میں داخل ہونا۔ زوجۂ یزید (ہند) کا خواب دیکھنا۔ حضرت زین العابدینؑ کو زیارت سر امام حسینؑ کی اجازت نہ ملنا۔ اہل بیتؑ کی مدینۂ منورہ کو واپسی اور اربعین کو کربلا میں ان کی عزاداری کا حال بیان کیا گیا ہے۔

باب ششم

اس میں یوسفؑ کی بھائیوں سے ملاقات۔ یہودا کو حضرت یوسفؑ کا جامہ لے کر یعقوبؑ کے پاس بھیجنا اور عود بصارت یعقوبؑ۔ حضرت یعقوبؑ کا مصر جانا اور ان کا شایانِ شان استقبال۔ اہل بیتؑ کا واپس مدینہ پہنچنا۔ امام زین العابدینؑ کا بشیر کو بُلا کر مرثیہ نظم کرنے کے لیے کہنا۔ اہل یثرب کو شہادت حسینؑ کی خبر ملنا اور ان کا ماتم میں مصروف ہو جانا۔ حضرت حمزہؓ کے واقعۂ شہادت اور ہندہ کی ان کی لاش کے ساتھ بدسلوکی بیان کی گئی ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مرزا دبیر نے اس تصنیف میں واقعات کو ربط دینے میں اپنی فطری ذہانت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ مختلف واقعات باہمی طور پر مربوط ہو گئے ہیں جس سے تاثر میں اضافہ ہوتا ہے۔

"ابواب المصائب" کی زبان اتنی آسان اور عام فہم ہے کہ آج جبکہ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ مدت اس تصنیف کو ہوئی اس سے وہی تاثر لیا جائے گا۔ اس میں فارسی الفاظ وتراکیب کا استعمال عبارت کو بوجھل نہیں بناتا بلکہ ان کا فطری استعمال اردو کی لسانی وادبی روایت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

"ابواب المصائب" میں تاریخی واقعات ہیں جنھیں احادیث و روایات کی روشنی میں ہی پیش کیا گیا ہے۔ اس پر شریعت کی فقہی پابندیاں سونے پر سہاگہ کا درجہ رکھتی ہیں مگر مرزا دبیر نے تمام پابندیاں قبول کر کے واقعات ایسی زبان میں پیش کیے کہ معلوم ہوتا ہے کوئی آنکھوں دیکھے واقعات بیان کر رہا ہے۔ جہاں انھوں نے عربی عبارتوں کو نقل کیا ہے وہاں ان کی مختصر تشریح بھی سادہ اور آسان لفظوں میں کر دی ہے جہاں اشعار کا استعمال کیا گیا ہے وہاں بھی زبان کا خیال رکھا ہے۔ نظم کی زبان بھی آسان اور سادہ ہے۔ مرزا دبیر ایجاد مضامین، خوبصورت تشبیہوں اور عالمانہ خیالات کے لیے بہت مشہور ہیں مگر اس تصنیف میں شامل نظموں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا کمال نہیں دکھانا چاہتے بلکہ آسان لفظوں میں صرف اپنا مقصد بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس زمانے کے مذاق کے خلاف اس میں مسجع اور مقفیٰ عبارتیں بھی نظر نہیں آتیں۔

"ابواب المصائب" میں واقعات کا تسلسل قابل توجہ ہے جس میں بتدریج قصہ آگے بڑھتا ہے۔ واقعات سامنے آتے جاتے ہیں اور انسان کے تجسس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ایک فصل سے دوسری فصل اور دوسری فصل سے تیسری فصل کی طرف بڑھتے ہوئے قاری یہ محسوس نہیں کرتا کہ اس نے کچھ کھو دیا ہے یا یہ کہ وہ ایک دنیا سے دوسری دنیا میں چلا گیا ہے۔ کہیں کہیں ضرور یہ محسوس ہوتا ہے کہ واقعات میں زبردستی ربط پیدا کیا جا رہا ہے مگر اس کا سمجھنا مشکل نہیں کہ جو گنجائش واقعۂ کربلا میں ہے جتنے پہلو اس واقعۂ عظیم کے ہیں مصائب کی جو داستان اس واقعے سے منسوب ہے، واقعۂ حضرت یوسفؑ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ واقعۂ کربلا زندگی کے ہر پہلو کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ دنیا کی کسی بھی مصیبت، کسی بھی قربانی اور پریشانی کا میدان کربلا آئینہ ہے۔ یہ انسان کی قربانی پرکھنے کی ایک کسوٹی بھی ہے اور وجہ تسلی بھی۔ اگر مرزا دبیر کربلا کے واقعات کو پہلے بیان کرتے تو اس سے یہ تصنیف غیر متوازن ہو جاتی۔ مصائب حضرت یوسفؑ کی توجیہ اور تشریح، مصائب اہل بیتؑ کے مقابلے میں کیا ہو سکتی ہے۔ دوسرا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ مرزا دبیر عزاداران حسینؑ کے پڑھنے اور انھیں کی مجلسوں میں پڑھنے کے لیے یہ کتاب تالیف

کرر ہے تھے۔ اس طرح واقعات حضرت یوسف نے تمہید کا کام کیا۔ سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ اس تالیف کا حجم نہیں بڑھنے پایا۔ واقعات یوسف نے اس کی حدیں خود بخود مقرر کردیں، ورنہ جو مرثیہ گو مختصر واقعات کے جزئیات تین تین سو بند میں پیش کرتا ہو، ایک ساتھ دو دو کاتبوں کو دو مختلف مرثیے لکھوا سکتا ہو، ایک رات میں پورا مرثیہ نظم کرسکتا ہو اس سے نثر میں اتنی مختصر سی تالیف کی امید رکھنا کیسے ممکن ہے۔ اس نے اس تالیف میں تسلسل قائم رکھنے میں بھی مدد دی۔

اکثر و بیشتر مرزا دبیر قصہ کے درمیان ایک جملہ ایسا لکھ دیتے ہیں کہ پڑھنے یا سننے والے کو جذبات پر قابو نہیں رہتا لیکن یہ عمل فطری انداز میں ہوتا ہے۔ شدت جذبات سے مجبور ہوکر وہ آہ بھرتے ہیں یا نالہ سر کرتے ہیں اور اسی میں ان کا مقصد پورا ہوجاتا ہے۔

- ''ابواب المصائب'' میں تفنن طبع کے مضامین بھی ہیں۔ مرثیہ گویوں کا موضوع اگرچہ تاریخی ہے مگر شاعر کا کام صرف واقعہ میں رنگ بھرنا نہیں ہے۔ وہ خوش ذوق مصور کی طرح اس میں اپنے موقلم سے جان ڈال دیتا ہے، اپنے رنگوں سے حیات بخشتا ہے۔ شاعر واقعے کا ایک خاکہ لے لیتا ہے اور پھر اس میں جزئیات کی رنگ آمیزی کرتا ہے۔ بے شک وہ اس واقعے کی حدود کے اندر رہنے کی سعی کرتا ہے مگر اپنی نزاکت حس سے وہ ایسے باریک پہلوؤں کو بھی ابھارتا ہے جو بادی النظر میں سامنے نہیں آتے اور جب سامنے آجائیں تو واقعے کا ایک جز معلوم ہوتے ہیں۔ مرثیہ گویوں کا واقعہ چونکہ مذہبی بھی تھا اس لیے اس میں احتیاط سب سے پہلی شرط تھی کیونکہ مذہب میں تصرف اور تحریف کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یوں تو بعض لوگ اپنے مطلب کے لیے یا اپنی جہالت کے سبب سے غیر معتبر فتوے بھی صادر کرتے ہیں مگر مرثیہ گویوں کے سامنے ذاتی مفاد کی کوئی اہمیت ہی نہیں، اگر ہوتی تو وہ قصیدے کہتے۔ مرثیہ گویوں کے بارے میں خاص طور پر میر ضمیر، مرزا دبیر، میر انیس کے متعلق یہ بغیر کسی مبالغہ کے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اعلیٰ پائے کے عالم تھے اس لیے اسلامی عقائد، تعلیمات اور واقعات تاریخی سے تصادم روا نہیں رکھ سکتے تھے۔

''ابواب المصائب'' میں سورۂ یوسف کی تشریح کا معاملہ تھا۔ یہ جو ایک طرف مذہبی تھا تو دوسری طرف تاریخی بھی تھا۔ مرزا دبیر نے نہ صرف ایک تاریخی خدمت کی بلکہ خود تاریخ کی بھی ایک خدمت انجام دی ہے۔

مرزا دبیر عصری تاریخ اور عصری واقعات کا بھرپور شعور رکھتے تھے۔ ''ابواب المصائب'' میں انھوں نے ایک تاریخی حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ عزاداری کو زیادہ عروج کب سے ملا اور عزائے محرم سے اربعین تک اودھ میں یہ مستقل طور پر کس عہد سے شروع ہوئی۔ دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں:

''ہمارے بادشاہ عصر خلد اللہ ملکہ، وسلطنتہ، کو جناب احدیت نے فخر سلاطین سلف اور رشک بادشاہان عصر پیدا کیا کہ ازل سے آج تک کسی نے بنائے تعزیہ داری تا اربعین نہ رکھی الا اس بادشاہ خلائق پناہ نے یہ رسم حسنات مقرر فرمائی۔''(10)

عصری تاریخ کا مواد اس طرح بھی فراہم کیا ہے:

''بادشاہ اس عصر کا کہ جمیع خوبیوں سے آراستہ اور تمام نیکیوں سے پیراستہ ہے......... حقا کہ آبا و اجداد اس بادشاہ سلیمان جاہ دارا اور دربان سکندر ایوان یوسف عہد نوشیروان عصر ابوالنصر قطب الدین بادشاہ غازی نصیر الدین حیدر خلد اللہ ملکہ، وسلطنتہ، کے بانی خیر و حسنات تھے۔ چنانچہ نہر آصفی بنائی ہوئی جناب نواب آصف الدولہ مرحوم قریب نجف اشرف کے مثل چشمۂ کوثر جاری ہے۔ ازیں قبل ہر ایک کی ذات بابرکات سے بنیاد فیض یادگار آفاق ہے۔''(11)

اس طرح سے عصری تاریخی حالات کا اس تصنیف سے اندازہ ہوتا ہے۔ قدیم تاریخ کے واقعات بلحاظ موضوع اہم ہیں مگر موقع پیدا کرکے عصری تاریخ کے بارے میں کچھ لکھنا ان کی اس تمنا کی دلیل ہے کہ عصری تاریخ کا شعور رکھنے کے ساتھ ساتھ اسے محفوظ رکھنے کے بھی مشتاق تھے۔

''ابواب المصائب'' میں موازنے کی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ موازنہ اگرچہ واقعاتی ہے مگر اس میں ایک کشش ہے کہ دونوں قسم کے واقعات میں ایک خصوصیت مشترک ہے جو ایک طرف شدت اختیار کرتی ہے اور دوسری طرف اس میں اتنی شدت نہیں۔ مرزا دبیر نے اگرچہ اعلان نہیں کیا ہے اور نہ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے مگر پوری کتاب میں موازنہ اور میزان کا پہلو واضح ہے۔ ''نخل ماتم'' یا ''فسانۂ عجائب'' میں یہ بات نہیں۔ ایک ہی کردار یا شخصیت کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو رقم کرنا یا ایک ہی واقعے کے مختلف پہلوؤں میں موازنہ کرکے ان کے اسباب و علل کو سامنے رکھنا تو ایک عام چیز ہے مگر دو مختلف واقعات بلکہ دو مختلف داستانوں کی مشترک خصوصیات کو پیش کرکے یہ تاثر پیدا کرنا کہ شدت کی منزل کہاں ہے اور قاری کے ذہن پر اپنے تاثرات نقش کرنا دشوار ہے اور مرزا دبیر اس میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اول الذکر کی ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے:

''جب یعقوب علیہ السلام مایوسِ جمال یوسفؑ سے بیہوش ہوکر ہوش میں آئے تو فی الفور اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ گرگ کو حاضر کرو۔ فرزندان یعقوبؑ طرف صحرا کے جاکر ایک گرگ کو پکڑ لائے اور منہ اس کا خون سے بھر کر اپنے باپ کو دکھایا یعقوبؑ نے گرگ کی طرف متوجہ ہوکے فرمایا کہ تو نے میرے نور نظر کو کھایا ہے۔ گرگ نے زبان فصیح سے عرض کی .... مجھ سے یہ فعل زبوں ظاہر ہوتا جس وقت مجھ کو یہ طاقت ہو کہ گوسفندوں کو تیری ضرر نہ پہنچاؤں کس طرح فرزند عزیز کو تیرے کھاؤں اور سوا اس کے گوشت نبیوں کا اور ولیوں کا ہم پر حرام ہے اور آزار پہنچانا اور اذیت دینا ان کو ہمارے مذہب میں گناہ عظیم ہے اور خطا ہے۔ اے مومنو جس وقت حیوانات، دل دکھانا، انبیاء

کہ اور اولیا وہ اپنے مذہب میں حرام جانیں اور گناہ کبیرہ سمجھیں و معصیا کس امت کے نبی نے کس دلیل سے اور کس طریق سے ذبح کرنا فرزند رسول خدا کا حلال و جواز جانا۔ القصہ بعد انکار گرگ نے زمین خدمت کو بوسہ دے کر عرض کی یا نبی اللہ میں اس دیار میں غریب الوطن ہوں اور مصر کی طرف سے ملاقات کو اپنے بھائی کی کہ صفا میں ہے مشقت سفر کی اٹھا کر اس ولایت میں گیا تھا وہاں سے عزم وطن کر کے آج یہاں وارد ہوا تھا کہ تمھارے بیٹوں نے ناحق مجھے پکڑ لیا اور گردن اور ہاتھ میرے باندھ کر آپ کے حضور میں حاضر کیا اور متہم کیا یوسف کی اذیت رسانی سے مجھے۔ یعقوبؑ نے باتیں اس گرگ کی گوش حسرت و افسوس سے سن کر اپنے بیٹوں کی طرف منھ کیا اور کہا گرگ مصر اپنے بھائی کے ملنے کے لیے کہ صفا میں رہتا ہے رنج سفر دور دراز کا اختیار کرے اور تم بے جہت اپنے عزیز بھائی یوسف کو صحرا میں لے جاؤ اور اسے غافل ہو کر ضائع کر دو۔"(12)

"ابواب المصائب" کے دیباچہ میں سورۂ یوسف کے نزول کے اسباب بیان کیے گئے ہیں کہ ایک روز پیغمبر آخر الزماں حسنینؑ کو اپنے زانوؤں پر بٹھلا کر پیار کر رہے تھے کبھی لبوں کا بوسہ لیتے تو کبھی حلقوم کا۔ ناگاہ اللہ کی طرف سے حضرت جبرئیل نازل ہوئے اور دریافت کیا کہ آپ کو اپنے دونوں نواسوں میں کون زیادہ عزیز ہے۔ جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کہ دونوں میرے لخت جگر اور نور نظر ہیں۔ حضرت جبرئیل نے کہا کہ خالق مختار نے فرمایا ہے کہ یہ دونوں آپ کے نواسے شہید ہوں گے۔ یہ سن کر حضرت رسالت مآبؐ پر گریہ طاری ہوا اور دریافت فرمایا کہ انھیں کون شہید کرے گا۔ حضرت جبرئیل نے جواب دیا کہ وہ لوگ آپ کی امت سے ہوں گے، اور آپ سے شفاعت کی امید بھی رکھتے ہوں گے۔ وہ لوگ انھیں بے قصور قتل کریں گے۔ یہ سن کر حضرت رسالت مآبؐ کے ملال میں مزید اضافہ ہوا پھر جبرئیل نے تسلی کے لیے یہ مژدہ دیا کہ ان فرزندوں کا خوں بہا روز قیامت شفاعت امت ہوگا۔ اس کے بعد قصۂ یوسف تسکین رسولِ مقبولؐ کے لیے بیان کیا۔(13)

روضۃ الشہداء میں بھی سورہ یوسف کے نزول کی وجہ یہی بیان کی گئی ہے۔(14) غرض مرزا دبیر کی یہ تصنیف کئی خصوصیات کی حامل ہے اور اس کی رواں نثر کو دیکھ کر یہ بتانے میں کسی قسم کا مبالغہ نہ ہوگا کہ مرزا دبیر کو زبان پر پوری قدرت حاصل تھی اور وہ جہاں جیسی زبان چاہتے استعمال کر سکتے تھے۔ اتنی مدت گزر جانے کے باوجود اس تصنیف کی زبان اب بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ مرزا دبیر کے لیے یہ تصنیف کوئی سرمایۂ افتخار نہیں تھی لیکن اس اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انھوں نے نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی مرزا غالب(15) کی طرح مقبولیت حاصل کی۔

آخر میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"بادشاہ مصر نے باعزاز و اکرام یوسف کو قید سے طلب کیا۔ جس وقت یوسف علیہ السلام آئے تو وہ پا پیادہ ہوا اور شروط استقبال بجا لایا۔ یوسف نے زبان عربی میں سلام کیا۔ مالک نے کہا یہ کیا زبان ہے حضرت نے فرمایا کہ یہ زبان ہے میرے عم اسمٰعیل ذبیح اللہ کی۔ مالک نے یوسف کو کرسی زریں پر بٹھلایا اور چتر زرنگار بالائے سر پیشوائے ابرار پر رکھا اور خلع بخلعت گرانمایہ فرمایا اور زبان بیان معذرت میں کھولی۔ واویلا غریبی یعقوب آل عبا سے جس وقت بیمار کربلا روبروئے یزید آئے تو لکھا ہے کہ اس بے حیا نے چار گھڑی روبروئے تخت ایستادہ رکھا کہ حرارت آفتاب سے پوست اہل بیت کے چہروں کا گر پڑا تھا اور بعد اوسکے اوس مکان میں قید کیا کہ نہ فرش تھا نہ سایہ۔"(16)

حواشی:

1. اس موضوع پر اس دور کی ایک دیگر تصنیف 'نخل ماتم' مصنف مرزا جعفر علی فصیح دستیاب ہے جو 1262ھ (1846) میں شائع ہوئی۔ مرزا دبیر کی تصنیف "ابواب المصائب" کی طرح اردو نثر کی ابتدائی کاوشوں میں اس کا ذکر بھی ناگزیر ہے جس پر اہل نظر نے توجہ نہیں کی ہے۔ ابواب المصائب اور نخل ماتم دونوں تصانیف مقصد کی یکسانیت کے باوجود انداز بیان میں ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فصیح نے ابواب المصائب کا مطالعہ نہیں کیا تھا یا دوسری صورت میں اس کے اسلوب سے عمداً پرہیز کیا۔ راقم کو نخل ماتم کے دو مطبوعہ نسخے حاصل ہوئے جو سید محمد رشید (جعفر منزل لکھنؤ) کی ملکیت ہیں۔ اس طرح کے دو نسخے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن (لکھنؤ) کے کتب خانے میں بھی ہیں۔ ان میں سے ایک نسخہ جس پر مقدمہ کا غالب گمان ہے، 1846 / 1262ھ میں مرزا جعفر علی کربلائی نے مطبع حیدری لکھنؤ سے شائع کیا۔ نخل ماتم کی تفصیل اس باب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔
2. حیات دبیر ج ا صفحہ -280-81
3. ابواب المصائب صفحہ -166
4. ایضاً
5. ابواب المصائب صفحہ -5-6
6. تاریخ ادبیات ایران ص 322 (تہران 1321ھ) 1903
7. روضات الجنات فی اوصاف مدینۃ ہرات۔ سید محمد کاظم اسفزاری۔ تہران 1338ھ/ 1919 حاشیہ-278
8. کربل کتھا ص-877
9. کربل کتھا مرتبہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔ مطبوعہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی-1961
10. ابواب المصائب (دیباچہ) ص-4-5
11. ابواب المصائب ص-4
12. ابواب المصائب ص-88-90، باب-3 فصل-2
13. ابواب المصائب باب اول فصل-1، ص-10-11
14. روضۃ الشہداء ص-32 امام رکن الدین مسعود بن محمد معروف بہ امام زادہ۔
15. جب مرزا دبیر نے ابواب المصائب تصنیف کی اس کے 32 سال بعد غالب نے اردو میں خط لکھنا شروع کیے جو اس کے برسوں بعد طبع ہوئے اس کے باوجود ان کو باقاعدہ تصنیف نہیں کہہ سکتے۔
16. یہ مضمون تخلیقی نوادر میں شامل ہے۔

* * *

عبدالغنی مدہوش

ہماری مطبوعات "تعلیمی رہنمائی اور صلاح کاری" سے اقتباس

ابتدائی مدارس میں رہنمائی

آزادی کے بعد جب ہمارے یہاں تعلیمی سرگرمیوں کا ایک بامعنی دور شروع ہوا، تو یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ ہمارے بچوں کی مناسب تعداد اسکولوں میں داخل ہو۔ اس سلسلے میں کئی طرح کے اقدام کیے گئے۔ مثلاً ابتدائی منزل پر مفت، عام اور لازمی تعلیم رائج کی گئی اور بچوں کی تعلیمی حوصلہ افزائی کے لیے مختلف اقسام کی مالی امداد اور وظائف کا اہتمام کیا گیا۔

1950 میں حکومت ہند نے منصوبہ بندی کمیشن مقرر کیا اور اس کے ذریعے پانچ سالہ منصوبوں کے خاکے تیار ہونے لگے۔ چنانچہ پہلے ہی پانچ سالہ منصوبے سے ابتدائی تعلیم باضابطہ دی جانے لگی طرح طرح کی حوصلہ افزائی اور مفید منصوبہ بندی سے تمام اسکولوں میں بچوں کی تعداد کی شرح اور تعلیمی اخراجات میں اضافہ ہوتا رہا۔ مگر ہر طرح کی حوصلہ افزائی کے باوجود ابتدائی تعلیم کے تسلی بخش نتیجے اب تک نہیں نکل سکے ہیں امید تھی کہ 1980 میں چھ سے چودہ سال کے بچوں کا 80 فیصد حصہ اسکولوں میں داخل ہوجائے گا۔ لیکن ابھی یہ شرح 40 فیصد سے اوپر نہیں بڑھی اور اس سے بھی زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ جو بچے مختلف پرائمری اداروں میں داخل بھی ہوئے ان کی اچھی خاصی تعداد ابتدائی تعلیم ختم کیے بغیر اسکول چھوڑ کر چلی گئی۔ ہر سال تارک مکتب طلبہ کی تعداد برابر بڑھتی جارہی ہے۔ آج کل تو صورت حال اور نازک ہوگئی ہے۔ بعض ریاستوں مثلاً جموں اور کشمیر میں چھوٹی عمر کے بچوں کے لیے خاص پیشہ ورانہ ادارے شروع کیے گئے ہیں جہاں وہ صرف مختلف پیشوں سے متعلق بنیادی ہنرمندیاں حاصل کررہے ہیں اور کم عمری میں وہ روزی کمانے کی فکر سے روبرو ہورہے ہیں۔

شروع میں رہنمائی پروگرام صرف پیشوں کی تعلیم یا ان کی تیاری کے لیے ضروری مضامین کی تعلیم تک محدود تھا۔ رہنمائی کا صرف یہ مطلب سمجھا جاتا تھا کہ اس کی بدولت ایک شخص صحیح پیشے کا انتخاب کرسکتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال میں ابتدائی اسکولوں کے کم عمر بچوں کے لیے کس طرح کی رہنمائی کی جاسکتی تھی! اس لیے ابتدائی اسکولوں کو اس خدمت سے بے بہرہ رکھا گیا۔

(1) ابتدائی تعلیم میں رہنمائی کی ضرورت

تعلیم کے ابتدائی مراحل پر اس کی زبردست ضرورت محسوس کی جانے لگی

1966 میں جب تعلیمی کمیشن کی رپورٹ سامنے آئی تو اس میں پرزور الفاظ میں کہا گیا کہ:

> "رہنمائی خدمت صرف طلبہ کو پیشے سے متعلق فیصلے میں، یا تعلیمی مضامین کے انتخاب میں ہی مدد نہیں کرتی بلکہ اس کے ذریعے سے ان کی شخصیتوں کی ہمہ گیر نشوونما ہوتی ہے۔ اس لیے ہماری سفارش ہے کہ رہنمائی کو تعلیم کا لازمی عنصر سمجھا جانا چاہیے۔"

ابتدائی تعلیم سے ہی رہنمائی پروگرام کی شروعات کا سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ اس دور میں عمر کے اعتبار سے بچے چھوٹے ہوتے ہیں اس لیے رہنمائی کارکن ان کی مشکلات کا فوراً پتہ چلا سکتے ہیں اور پھر رہنمائی کا کام شروع کرسکتے ہیں۔

تعلیم کا ایک یہی دور ہے جبکہ بچوں کے والدین استادوں کے بہت قریب آکر اپنے بچوں کے مسائل پیش کرسکتے ہیں اور ایک دوستانہ ماحول میں ان کی تعلیمی قابلیت کو فروغ دینے کے مشورے دیے جاسکتے ہیں۔ اساتذہ جو مسلسل بچوں پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ ان کے والدین کے سامنے ان کے بچوں کے بارے میں اپنے مشاہدات رکھ کر بامعنی منصوبے بناسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کے مراحل میں والدین کے اجتماعات بڑے کامیاب ثابت ہوتے ہیں اور سبھی والدین گرم جوشی کے ساتھ اپنے بچوں کے تعلیمی پروگراموں میں حصہ لیتے ہیں۔ جب یہی بچے بڑے ہوجاتے ہیں یعنی ثانوی منزل پر آتے ہیں تو یہ صورت حال قائم نہیں رہتی کیونکہ اسکول کے ساتھ والدین کے تعلقات کم ہوجاتے ہیں۔

اس مرحلے پر چونکہ ایک استاد زیادہ وقت بچوں کے ساتھ گزارتا ہے اس لیے پڑھائی لکھائی کے کاموں کے علاوہ بچوں کی نشوونما کے بہت سارے راستے نکل سکتے ہیں۔

ابتدائی استادوں کے مروجہ تربیتی پروگرام بھی کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں بچوں کو توجہ کا مرکز قرار دیا جاتا ہے۔ اس لیے امید کی جاسکتی ہے کہ معمولی کوشش سے ابتدائی اسکولوں کے اساتذہ کو رہنمائی کے کام کی ترغیب دی جاسکتی ہے۔

● تعلیمی عمل میں رہنمائی کی بہت اہمیت ہے۔ مختلف مراحل پر طلبہ کی بہتر رہنمائی اچھے کیریئر کی ضمانت ہے۔ اس کتاب میں ابتدائی اور ثانوی درجات کے علاوہ پیشہ ورانہ رہنمائی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ 192 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 67 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

(ب) رہنمائی اور بچے کی نشوونما

ہر بچہ جسمانی لحاظ سے عمر کے کسی مخصوص حصے میں کسی نہ کسی طرح کی صلاحیت کا حامل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک سال کا بچہ چل سکتا ہے، دو سال کا ٹھیک طرح سے بات کرسکتا ہے اور تین سال کا بچہ چند حروف یاد بھی کرسکتا ہے اس طرح سے دیکھیں تو نشوونما کا ایک معمول بن سکتا ہے جس کی بنا پر مختلف بچوں کو اپنی عمر کے لحاظ سے مقابلہ کرکے جانچ سکتے ہیں کہ آیا وہ حسب معمول ترقی کررہا ہے یا معمول سے کسی طرح ہٹا ہوا ہے یعنی کم ہے یا زیادہ؟ بعض والدین اس وقت پریشان ہوجاتے ہیں جب کہ ان کے بچے معمول سے ہٹ کر کسی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہیں، مثلاً ایک بچہ جو ابھی گیارہ مہینے ہی کا ہے، چلنے لگتا ہے جبکہ اُسے اٹھارہ مہینے میں چلنا شروع کرنا چاہیے یا جبکہ بچے کو دو سال کے بعد ٹھیک بات کرنی تھی، وہ دس مہینے کی عمر ہی سے بولنے لگتا ہے اس طرح کے مظاہروں سے بعض والدین کو تشویش ہوجاتی ہے اس لیے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ نشوونما کا ایک خاص معمول ہونے کے باوجود ہر بچے کی نشوونما بعض لحاظ سے الگ الگ اعتبار سے ہوتی ہے اس لیے اس کی انفرادیت کو سمجھا جانا چاہیے اور کسی طرح کے خوف یا تشویش میں پڑے بغیر بچے کے لیے تعلیمی اور دیگر پروگرام اس کی انفرادیت کو سمجھ کر وضع کرنے چاہیے۔ اب اگر یہ بات معلوم ہوئی کہ معمول سے کمی بیشی کسی انفرادی وجہ کی دلیل نہیں ہے تو اس صورت میں بھی مدد اور مشورے کی صورتیں واضح کی جاسکتی ہیں۔ امریکہ کے ابتدائی اسکولوں میں دیکھا گیا ہے کہ بہت سے بچے نہ صرف یہ کہ نشوونما کے عام اصول سے انحراف کررہے ہیں بلکہ ان کی شخصیتوں کے مختلف پہلوؤں میں بھی نمایاں فرق ہے۔ مثلاً ایک چوتھی جماعت کا بچہ اتنا ذہین ہے کہ چھٹی جماعت کے ریاضی کے سوالات حل کرتا ہے مگر جسمانی اعتبار سے دوسری جماعت کے بچے کا ہم پلّہ معلوم ہوتا ہے۔ جب اس بچے کے والدین کی اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی تو معلوم ہوا کہ جسمانی پسماندگی کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے، بلکہ بچے کے اپنے انفرادی معیار کے لحاظ سے اونچا دیکھ کر اسکول صلاح کار کی مدد سے اس کے لیے زیادہ اعلیٰ تعلیمی پروگرام مرتب کرایا۔

اس طرح سے ابتدائی اسکولوں کے صلاح کاروں کی یہ ذمے داری ہوجاتی ہے کہ وہ بچوں کی انفرادی نشوونما پر بطور خاص توجہ دیں اور اپنے مسلسل مشاہدے کی بنا پر والدین کو بچوں کی نشوونما کے بارے میں وقتاً فوقتاً مشورے دیتے رہیں۔ کبھی کبھی والدین بچے کی تعلیمی پیش رفت دیکھ کر بہت پریشان ہوجاتے ہیں اگر ان کا بچہ کسی طرح سے جماعتی معیار سے نیچے ہو تو بچے کی انفرادی نشوونما کے جملہ پہلوؤں کو سامنے لایا جاسکتا ہے اور بچے کی پروان چڑھتی شخصیت کو مضر اثرات سے بچایا جاسکتا ہے ایک تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ بہت ساری بدصورت لڑکیاں تعلیم کے اعلیٰ مراحل تک اس لیے نہیں پہنچ سکیں کہ انھیں اپنی بدصورتی کا شدید احساس تھا، اسی طرح دوسری جسمانی خامیوں کو بھی بچوں کی تعلیمی اور سماجی خامیاں تعلیمی اور سماجی نشوونما پر برا اثر ڈالتی ہیں۔

ہر بچے کو پیدائش کے دن سے جسمانی ضرورتوں کے علاوہ کئی اور باتوں کی طرف دھیان دینا پڑتا ہے تاکہ اس کی شخصیت معمول کے مطابق پروان چڑھے۔ ان باتوں میں سماجی تقاضے درجۂ اول کی حیثیت رکھتے ہیں ہر بچہ بڑی حد تک بلا روک ٹوک اپنے دل پسند مشغلے کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس پر سماجی اقدار کی اتنی زبردست چھاپ پڑنے لگتی ہے کہ اسے ایسا لگتا ہے کہ گویا اس کی ساری آزادی سلب کی جارہی ہے۔ مثال کے طور پر ابتدا میں ایک بچہ کبھی کبھی گالی گلوچ سے کام لیتا ہے اور کسی کو گالی دینے یا برے الفاظ سے یاد کرنے میں اسے تامل نہیں ہوتا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی یہ عادت چھوٹ جاتی ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا یا رہنا سہنا ہوتا ہے وہ اس طرح کی بدکلامی زیادہ دیر پسند نہیں کرتے اسے صرف وہی باتیں سیکھنی پڑتی ہیں جنھیں دوسرے لوگ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے رہیں یا جن کے اظہار میں اسے مثبت تقویت حاصل ہوتی ہے، جس کی بدولت بچہ سماجی رول اختیار کرنے اور نبھانے میں کامیابی محسوس کرتا ہے۔ کبھی کبھی ابتدائی اسکولوں میں ایسے لڑکے لڑکیاں داخلہ لیتے ہیں جن کے سماجی رول زیادہ واضح نہیں ہوتے یا جو ابھی بعض غلط کاریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اسکولوں میں ایسے بچوں کے ساتھ عام طور پر زیادتی کی جاتی ہے اور بہت سے امور میں سختی برتی جاتی ہے۔ اس کا فوری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے میں اسکول کے خلاف ایک باغیانہ جذبہ پیدا ہوجاتا ہے اور وہ کبھی کبھی اسکول سے بھاگ نکلنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ اکثر تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ اسکول سے بھگوڑے پن کی ایک سنگین وجہ اسکول کا سخت ماحول ہے جو ان بچوں کے لیے سخت ترین ہوجاتا ہے جو کسی لحاظ سے سماجی امور میں اپنے ہمجولیوں کے ساتھ مطابقت نہیں کرتے۔ ایسے حالات میں ہم کیا امید رکھیں کہ ابتدائی تعلیم میں داخلے کی شرح بڑھے اور جو بچے داخل ہوں وہ تعلیم سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں؟ اگر کسی طرح سے تعلیم کے لیے رغبت بڑھائی بھی جائے (جیسے چوتھے پانچ سالہ منصوبے میں بچوں کے لیے مفت کتابوں، اور لکھائی پڑھائی کے دیگر سامان کی فراہمی اور دوپہر کے کھانے کی مفت تقسیم) تاہم اسکول کا سخت ماحول پاکر بچوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اسکول چھوڑ کر بھاگ جائے گی۔ یہی وہ اہم مسئلہ ہے جس میں ایک اسکول صلاح کار بہت مفید کردار ادا کرسکتا ہے۔ وہ ابتدائی اسکول میں تمام اساتذہ کو اعتماد میں لاکر

بچوں کے مسائل اور ان ابتدائی خامیوں سے واقفیت دلا سکتا ہے۔ اور بچوں کے لیے اسکول میں خوشگوار اور سازگار ماحول تیار کرسکتا ہے۔

گھر پر اسکول میں بعض ناکامیوں کی وجہ سے کئی بچے ایسا ردِّعمل اختیار کرتے ہیں جسے ایک خاص طرح کی دماغی صورت سمجھنا چاہیے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ گھر میں ایک پانچ سال کا بچہ اپنی ماں کو بہت تنگ کرتا تھا، بار بار لاتیں مارتا، بال کھینچتا، کپڑے پھاڑتا، گندگی پھیلاتا، غرض وہ سب کام کرتا جس سے اس کی ماں پریشان ہوجاتی تھی۔ اس بچے کا جب کسی ماہر نفسیات نے مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ سب حرکات بہت کم عرصے سے دیکھنے میں آئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گھر میں ایک اور بچہ پیدا ہوا ہے اور یہ بچہ نوزائیدہ کے سامنے اپنے والدین کی توجہ حاصل کرنے میں ناکامی محسوس کرتا ہے اور ردِّعمل کے طور پر ایسی حرکات کرتا ہے جن سے اپنے والدین کی پہلی سی توجہ پھر سے حاصل کرسکے۔ اس طرح کے مسائل کبھی کبھی بلکہ اکثر اوقات پہچانے نہیں جاتے ہیں اور نتیجتاً نظرانداز کردیے جاتے ہیں۔ لیکن ایسا دیکھا گیا ہے کہ جن بچوں کے تجربات میں اوائل عمر سے ہی ناکامیوں کا ڈر حاوی رہتا ہے وہ اکثر دفاعی اعمال میں پناہ لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے اعمال سے وہ خود بھی بیزار ہوتے ہیں کیونکہ ان سے یہ اعمال صرف مجبوری کی وجہ سے سرزد ہو رہے ہیں۔

آپ نے ایسے بچوں کو دیکھا ہوگا، جو بات بات پر جھوٹ بولتے ہیں۔ آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ بچے کی نظر سے دیکھیں، تو جھوٹ بولنے سے اس کی کوئی نفسیاتی ضرورت پوری ہوجاتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بعض اوقات اس کی پریشانیاں جھوٹ بولنے سے ختم ہوجاتی ہیں۔ لیکن اکثر اوقات یہ حرکات عارضی تسکین بہم پہنچاتی ہیں اور کچھ دیر بعد وہ اپنے آپ سے غیر مطمئن ہوجاتے ہیں۔ اب اگر ہم معلوم کریں کہ یہ جھوٹ بولنے کی عادت اسے کیسے پڑی تو شاید طرح طرح کے عناصر کارفرما نظر آئیں گے۔ مثال کے طور پر اسے گھر میں شاید سچ بات بتادینے پر ڈانٹ پڑی ہے، جبکہ جھوٹ بولنے اور بات بنانے پر تعریف کی گئی ہے اس چیز کو ہم ایک اور مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں گے ایک بچہ اپنی ماں کے پاس بیٹھا تھا کہ کوئی رشتے دار آیا اور ماں نے اس رشتے دار کو کئی ایسی باتیں بتائیں جو اسے نہیں بتانی چاہیے تھیں۔ شام کو جب اس بچے کا باپ گھر آیا تو دن میں آئے ہوئے لوگوں کے بارے میں پوچھ تاچھ کی۔ رشتے دار کے بارے میں کہا گیا کہ وہ آیا تھا اور اس نے ایسی ایسی باتیں بتائیں۔ بچے نے ماں کی بات کو بیچ میں کاٹ کر کہا کہ ایسا نہیں بلکہ ماں نے ہی یہ باتیں بتائی تھیں واقعی بچے کا بیان سچ تھا لیکن اس طرح کا بیان ماں کے خلاف جاتا ہے اس لیے بچے کو ڈانٹ پلائی جاتی ہے اور اسے خاموش کردیا جاتا ہے۔ آئندہ یہ بچہ ایسے بیانات دینے لگتا ہے جو اس کو فوری ڈانٹ سے بچا لیتے ہیں مگر پھر اس میں ایسی عادت پڑ جاتی ہے جو بہت مدت تک قائم رہتی ہے اور چونکہ یہ بری عادت اس کو سرزنش کے خوف سے بچالیتی ہے اس طرح یہ بری عادت اس کی شخصیت کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔

ایسی ہی عادات کے ساتھ بچہ اسکول میں آتا ہے اور اگر یہاں پر اس کے سمجھنے اور اصلاح کی کوئی کوشش نہ کی جائے تو خراب عادتیں اور پختہ ہوجائیں گی۔ موجودہ اسکولوں کی طرف ذرا دھیان دیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ اسکول میں طرح طرح کے خوف پیدا کرتے ہیں اور بچوں کی خود اعتمادی کو مجروح کرتے ہیں۔ ان سے مکمل اور نمونے کے کام کروانا چاہتے ہیں جس سے مجبوراً انھیں زیادہ واقف کار لوگوں سے ناجائز مدد لینی پڑتی ہے۔ اور دوسروں کے کام کو اپنا کام بتا کر پیش کرنا پڑتا ہے دراصل اس قسم کی چیزیں بچوں کی نشوونما کے بالکل منافی ہیں لہٰذا ابتدائی اسکولوں میں بچوں کے سمجھنے کی کوششیں کی جانی چاہیے۔ اس کے لیے اساتذہ کو اس بات کی طرف راغب کرنا ہوگا کہ وہ بچوں کی زندگی کے اصلی تقاضوں کو سمجھ لیں اور ان کی صلاحیتوں کو جانچ لیں اور پھر ان میں صحیح عادات پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

چار سے چھ سال تک

چار سے چھ سال تک کے بچے کی سب سے پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ اس کی جسمانی نشوونما کا عمل ٹھیک طرح ہوتا رہے وہ صحیح طور پر اپنے اعضا، ہاتھ، پیر اور آنکھ وغیرہ کو استعمال کرسکے۔ صلاح کار کی نگاہ سے یہ بات چھپ نہیں سکتی کہ کون سا بچہ جسمانی اعتبار سے معذور ہے یا کسی طرح دقت محسوس کررہا ہے اگر ایسی بات ہے تو اس بچے کی طرف فوراً توجہ دینی ہوگی۔ ایسے بچوں کے والدین سے مشورہ کرکے ان کی جسمانی خامی کا کسی حد تک تدارک کیا جاسکتا ہے۔ جماعت میں ایسے بچوں کو تو سب سے آگے بٹھایا جائے گا تاکہ ان کی تعلیمی پیش رفت باقی کلاس کے ساتھ ساتھ ہوتی رہے کہیں جسمانی کمزوری ان کی تعلیمی قابلیت کو مجروح نہ کرے۔

ابتدائی اسکول میں بچے کی سب سے اہم ضرورت تو یہ ہے کہ وہ اس زبان کے حروف سے شناسائی حاصل کرے، جس میں اس کی عمر بھر تعلیم ہوگی، حروف کی جان پہچان کے لیے نہایت ہی مؤثر ذرائع جیسے سمعی بصری امدادی سامان کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ حروف شناسی کے ساتھ ساتھ لکھنے کی بنیادی ہنرمندیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح سے بچے اپنے ابتدائی تعلیمی کام شروع کریں گے۔ اس کام میں اکثر سختی کی جاتی ہے۔ جیسا کہ مروّجہ اسکولوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ یعنی حروف شناسی اور لکھائی میں بے جا دباؤ اور جبر

سے کام لیا جارہا ہے۔ کبھی کبھی بچوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں کہ وہ فوراً سیکھ لیں۔ ان سختیوں کا یہ نتیجہ ہوسکتا ہے کہ بچے کے دل میں اسکول کے خلاف نفرت پیدا ہوجائے۔ اور وہ اسکول سے بھاگنے لگے۔ ابتدائی اسکولوں کے اساتذہ اگر رہنمائی اور صلاح کاری کے اصولوں سے واقف ہوں تو یہی تعلیمی تجربہ بچوں کے لیے دلچسپ ہوسکتا ہے اور بچے اپنی ابتدائی معلومات اور مہارت میں بلا کسی خوف کے اضافہ کرسکتے ہیں۔ مصنف کو اس وقت ایک اسکول کا خیال آتا ہے، جہاں ابتدائی جماعتوں میں مانٹی سوری کے اصولوں پر مبنی ایسے مشاغل کا اہتمام کیا جاتا ہے جن سے خود بخود کسی دباؤ یا جبر کے بغیر حروف شناسی کرائی جاتی ہے۔ وہاں بچوں کو باضابطہ ''ا، ب، پ'' وغیرہ کی مشق نہیں کراتے بلکہ بچوں کی روزمرّہ زندگی میں کام آنے والی چیزوں کو ان کے سامنے رکھتے ہیں اور پھر ان کے ناموں سے حروف اور ان کی آوازوں سے آشنا کرتے ہیں۔ اسکول صلاح کار کا فرض ہے کہ اس طریقے میں بھی حسب ضرورت ترمیم و ترتیب کے مشورے دیتا رہے۔ چار سے چھ سال تک کی عمر کے دوران بچوں میں اجتماعی اور سماجی رجحانات بھی ابتدائی شکل میں نمودار ہونے لگتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اس کی جماعتی زندگی کا آغاز بچے کے گھر سے ہوتا ہے لیکن وہاں اس کا رول اتنا واضح نہیں ہوتا جیسا کہ اسکول میں جہاں آکر اس کو ایسے بچوں کے ساتھ بیٹھنا پڑتا ہے جن کے ساتھ اس کی پہلے سے کوئی جان پہچان نہیں تھی۔ یہاں پر وہ گھر کی طرح اپنی دلچسپیوں کو پورا نہیں کرسکتا ہے جہاں معمولاً سبھی لوگ اس کی خوشی اور تسکین کے لیے کوشاں رہتے ہیں اس لیے اسکول میں اسے ایک خاص طریقۂ کار کو اپنانا پڑتا ہے تاکہ اس کی اپنی اور اس کے ساتھیوں کی دلچسپیاں بیک وقت پوری ہوسکیں۔ اس میں باہمی لین دین اور ایک دوسرے کی مدد درکار ہوتی ہے۔ اس طرح کی سماجی نشوونما کے لیے ابتدائی اسکولوں میں مناسب پروگرام بنائے جاسکتے ہیں۔

سات سے بارہ سال تک

کھیل کود اور جسمانی ورزش کے مختلف مشاغل، دوسروں کے ساتھ برادرانہ سلوک، معقول جنسی رویہ، لکھائی پڑھائی کی بنیادی مہارتوں میں دسترس، روزمرّہ استعمال کے تصورات کا علم، اخلاقی اقدار کی پیروی سماجی اداروں اور جماعتوں کی طرف موزوں رویے کا فروغ۔

عمر کا یہ حصہ یعنی سات سال سے بارہ سال تک بھی ابتدائی اسکول ہی میں گزرتا ہے، اس لیے اس دور کی ضروریات کا احساس بھی ابتدائی اسکول کے صلاح کار کے لیے ضروری ہے۔ اس دور میں بچوں کی جسمانی نشوونما تیز رو ہوتی ہے، اس لیے مختلف سماجی کھیلوں کو تعلیمی پروگرام میں داخل کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح اس مرحلے پر بچوں کے باہمی تعلقات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ جسمانی اور ذہنی پختگی میں اضافے کے ساتھ ساتھ بچے پر گھر کی گرفت ڈھیلی ہوتی جاتی ہے اور بچہ زیادہ تر اپنے یار دوستوں کے ساتھ جماعتی زندگی گزارنے لگتا ہے۔ اس صورت حال کو ٹھیک طرح سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ غلط فہمی اور غلط رویے سے یہ صورت بگڑ سکتی ہے۔ اس دور میں چونکہ بچوں کو اپنی جنس سے متعلق زیادہ واقفیت حاصل ہوجاتی ہے، اس لیے انھیں ایک لڑکا یا لڑکی کی معیشت سے اپنا واضح کردار ادا کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس معاملے میں اسکول و مدارس بچوں کو اپنا سماجی رول اختیار کرنے میں معاون ہوسکتے ہیں۔ مدارس بعض ایسے تعلیمی اور غیر تعلیمی مشاغل فراہم کرسکتے ہیں جن میں بچے اپنے بڑھتے ہوئے سماجی رول کو ادا کرسکیں۔

یہی وہ دور ہے جس میں اخلاقی اقدار کی نشوونما نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ بچے اپنے ضمیر کے خلاف کوئی بات کرنے پر رضامند نہیں ہوتے اور اخلاقی اقدار کو عزیز رکھنا شروع کردیتے ہیں۔ بچوں کی اس ضرورت کے پیش نظر انھیں صالح خطوط پر ابھرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

تعلیم کا مقصد بچوں کو شرافت، سمجھداری، احترام، جرأت مندی، دیانت داری جیسی اخلاقی اقدار کا پیرو بنانا ہے تاکہ جو بچے تعلیمی اداروں سے نکلیں، وہ شریف، دیانتدار اور سماجی اقدار کا احترام کرنے والے ہوں تعلیمی کمیشن کی رائے میں تعلیم کا مقصد ایسے لوگوں کی تیاری ہے جو ملک کے وسیع مفادات میں تعمیر و ترقی کے کاموں میں مدد دیں اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر جو کچھ تعلیمی اداروں میں ہورہا ہے وہ اس مقصد کے بالکل خلاف ہے۔ آئے دن قومی ملکیت کو تباہ کرنا، روز بروز ہڑتالیں منظم کرنا، بزرگوں اور بڑوں کی بے حرمتی کرنا، تعلیمی اداروں کو غیر معینہ مدت کے لیے بند کروانا وغیرہ ایسے مظاہرے ہیں جن سے موجودہ تعلیمی نظام پر حرف آتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام بچوں کی نشوونما کی ضروریات کو ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں سکا ہے اور خاص کر ابتدائی مراحل میں اس جانب کوئی توجہ نہیں دی جارہی ہے۔

ابتدائی اسکولوں میں رہنمائی خدمات کی ذمے داریاں

ابتدائی اسکولوں میں مخصوص صلاح کاروں کا ہونا چنداں ضروری نہیں۔ ان اسکولوں میں اساتذہ ہی رہنمائی کا کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ کو رہنمائی کی مبادیات سے واقف کرایا جائے۔ تعلیمی کمیشن کی رائے میں پرائمری اسکول کے اساتذہ سے صلاح کاری کی خدمات لی جاسکتی ہیں، البتہ ان کی تربیت کے لیے اس قسم کے پروگرام تشکیل دینا لازمی ہے۔

پروگرام

پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کے لیے ایسے تربیتی پروگرام منظم کرنے چاہئیں جن میں انھیں جانچ پرکھ کی تعلیمی آزمائشوں سے آگاہ کیا جائے، یعنی وہ بچوں کی انفرادی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو جانچ سکیں اور جانچ کے نتائج کو ان کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے استعمال کرسکیں۔

ہر ایک ٹریننگ اسکول یا کالج میں ایک ایسا لیکچرر ہونا چاہیے جو صلاح کاری اور رہنمائی کے کام میں ماہر ہو۔ وہ زیر تربیت اساتذہ کو رہنمائی کے بنیادی اصولوں اور طریقوں سے روشناس کرائے گا۔

ہر ٹریننگ اسکول سے ملحق اسکولوں میں رہنمائی کا پروگرام جاری کیا جانا چاہیے تاکہ زیر تربیت اساتذہ کو رہنمائی اور صلاح کاری سے متعلق مسائل کا احساس کرایا جاسکے۔ جہاں ممکن ہو پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کے لیے رہنمائی کے موضوع پر مختصر کورس منظم کیے جائیں۔

مادری زبان میں پیشوں سے متعلق اور رہنمائی کے موضوع پر لٹریچر تیار کیا جانا چاہیے۔ یہ تجاویز ابتدائی اسکولوں میں رہنمائی خدمات کی ضرورت کے پیش نظر پیش کی گئی ہیں۔

نصاب اور جماعتی ترتیب

سب سے پہلے ابتدائی اسکول کے استاد کو چاہیے کہ وہ بچوں کے لیے ایسے نصاب کا اہتمام کرے کہ بچے اس سے بجا طور پر عہدہ برآ ہوسکیں اور انھیں ناکامی کے خوف کا تجربہ نہ ہو اور ساتھ ہی وہ ایسی جماعت بندی کا انتظام کرے کہ بچے ابتدائی تعلیمی مہارتیں حاصل کرنے میں دشواری محسوس نہ کریں۔ تعلیمی آزمائشوں کی مدد سے یہ بھی معلوم کرنا چاہیے کہ جماعت میں کتنے بچے ایسے ہیں جو ذہنی طور پر بہت اعلیٰ یا ادنیٰ ہیں۔ کتنے ایسے ہیں جو جسمانی طور پر معذور ہیں یا سماجی معاملات میں نہایت پیچھے ہیں۔ ایسے بچوں کی نشاندہی کے بعد ان کے لیے ایسے تعلیمی اور تدریسی پروگرام تیار کرنے ضروری ہیں کہ بچوں کو بیٹھنے اور کام کرنے کے لیے صاف ستھری جگہیں ملیں۔ پورے اسکول کا ماحول دلکش ہو، سازوسامان خوش سلیقگی کے ساتھ آراستہ ہو۔ استاد کا اپنا لباس صاف ستھرا اور دیدہ زیب ہو، نیز اس کی عادات پسندیدہ ہوں۔

استاد کو ایسے لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات بڑھانے چاہئیں جن کا بچوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ تعلق ہو جیسے ڈاکٹر وغیرہ۔ ایسا کرنے سے فوری طور پر یہ فائدہ ہوگا کہ بچوں کو ان کی عمر کے تقاضوں کے مطابق صحیح اور مناسب مشورہ ملتا رہے گا۔

اسکول اور بستی کے تعلقات سب سے اہم ہیں بچوں کے والدین اور اساتذہ کو چاہیے کہ وہ بچوں کے والدین کے ساتھ بامعنی تعلقات پیدا کریں تاکہ بچوں کی بہتری کے پروگراموں میں ان کا تعاون حاصل کیا جاسکے۔ والدین کو بچے کی ترقی سے متعلق محض ایک ترقی کارڈ بھیجنا کافی نہیں ہے بلکہ والدین کے ساتھ بیٹھ کر ترقی رپورٹ کی روشنی میں بچے کی آئندہ ترقی کے لیے پروگرام بنانا چاہیے اور پھر والدین کی مدد سے جائزہ لینا چاہیے کہ مجوزہ پروگرام سے کیا کچھ حاصل ہوا۔

استاد کو بعض ایسے سماجی اداروں سے بھی رابطہ قائم کرنا چاہیے جو کسی نہ کسی طرح بچوں کی فلاح و بہبود کے کام میں لگے ہوں۔ ان میں خاندانی بہبود کے ادارے، این سی سی تنظیمیں، بچوں کی فلاح و بہبود کے ادارے شامل ہیں۔ اگر یہ سب ادارے اسکول کے کام میں دلچسپی لینے پر آمادہ ہو جائیں تو اسکول، طلبہ کے لیے ایک ایسی جگہ بن جائے گا جس میں ان کی مکمل شخصیت کی تعمیر ممکن ہے۔

□□□

اردو مرثیے کا ارتقا (ابتدا سے انیس تک)

مصنف: ڈاکٹر مسیح الزماں

مرثیے نے اردو شاعری کو بڑی وسعت، تنوع اور وقار بخشا ہے اور تقریباً تین صدیوں کے سفر میں تہذیبی قدروں، ادبی تقاضوں اور مذہبی معتقدات کے زیر سایہ پرورش پا کر حیات و کائنات کے بہت سے پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں کی یہ تحقیقی اور تنقیدی کتاب مرثیے کے آغاز سے اس کے ارتقائی سفر کے مختلف مدارج پر روشنی ڈالتی ہے اور اہم مرثیہ گو شاعروں کے فنی کارناموں کو بھی نمایاں کرتی ہے۔

صفحات: 468 قیمت: -/136 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تنویر عالم

فوڈ ٹیکنالوجی میں کیریئر کے مواقع

آج کل کی مصروف گہما گہمی اور ہلچل کی زندگی میں باورچی خانے میں زیادہ وقت گزارنے کی قطعی گنجائش نہیں، کھانے پینے کی عادتوں اور روزگار کی نوعیت اور طور طریقوں میں تغیر پذیری سے تیار کھانے اور مکمل طور پر پروسیس کیے گئے ڈبہ بند کھانوں اور مشروبات کی افادیت اور مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ جانوروں سے حاصل ہونے والی کھانے پینے کی اشیا اور زرعی خوراک کی پیداوار میں جدید ٹیکنالوجی کے استعمال نے خوراک کے روایتی تصور میں تبدیلی رونما ہورہی ہے۔ اب خوراک کا مقصد صرف پیٹ بھرنے اور گزر بسر کرنے تک محدود نہیں ہے بلکہ خوراک کی اضافی مالیت کے سہارے دولت کمانا بھی ہوگیا ہے۔ زراعت پر مبنی صنعتوں نے روزگار اور معاشی ترقی کی نئی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق فوڈ پروسیسنگ انڈسٹری تیزی سے ترقی کرنے کے ساتھ ہر سال 2.5 لاکھ افراد کو روزگار فراہم کرتی ہے۔ اس صنعت کے مستقبل قریب میں زیادہ تیزی سے ترقی کرنے کے امکانات کافی روشن ہیں۔ امید ہے کہ 2005 کے اختتام پر ہندوستان میں خوراک کا کاروبار 500,000 کروڑ روپے سے تجاوز کر جائے گا۔ خصوصی نوعیت کے ڈبہ بند خوراکی اشیا کی اضافی قیمت بڑھ کر 2005 کے اختتام تک 2,30,000 کروڑ روپے ہوجائے گی۔ لہٰذا خوراک کے وسعت پذیر تسلسل سے قومی معیشت کو آمدنی اور روزگار کے نقطۂ نگاہ سے خاطر خواہ فائدہ حاصل ہونے کی بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے۔

فوڈ ٹیکنالوجسٹ کی اہمیت: دنیا کی مسلسل بڑھتی آبادی اور قابل کاشت زمین کی قلت سے خوراک کی ضرورت اور پیداوار میں عدم توازن وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ اس عدم توازن کو پوسٹ ہارویسٹ ٹیکنالوجی، جدید سائنسی اصولوں پر مبنی پروسیسنگ کے طریقوں کے استعمال اور تربیت یافتہ ٹیکنالوجسٹ کی مدد سے کافی حد تک قابو میں رکھا جاسکتا ہے۔ اعلیٰ درجے کی جدید پروسیسنگ ٹیکنالوجی ہمارے نقصانات میں کمی، بہتر قسم کی اور غذائیت سے بھرپور خوراک اور روزگار کے وسیع تر مواقع فراہم کرنے اور پروڈیوسر اور صارف کے مابین ہم آہنگ تعلقات برقرار رکھنے میں معاون و مددگار ہوسکتی ہے۔ ہندوستان میں فوڈ پروسیسنگ صنعت کا آغاز گذشتہ صدی کی تیسرے دہائی میں ہوا تھا لیکن دیگر ممالک کی بہ نسبت یہ صنعت اب بھی کافی پسماندہ ہے۔ البتہ عالمی تجارتی نظام کے بعد اس صنعت کا فروغ پانا قدرتی ہوگا۔ فوڈ پروسیسنگ کی صنعت میں ایسے یونٹ قائم کیے جارہے ہیں جہاں کا پورا پیداواری نظام جدید ٹیکنالوجی پر مبنی ہے۔ اندرون ملک اور بین الاقوامی منڈی میں صرف ایسی اضافی مالیت کی اشیا کی افادیت اور معنویت ہوگی جو جدید مشین کاری، باریک بینی پر مبنی مہارت خصوصی اور کوالٹی کنٹرول مینجمنٹ کے جدید طریقوں اور اصولوں پر چلائے جارہے کاروباری بندوبست کا نتیجہ ہوں۔ ہندوستان میں بڑی مقدار میں انواع و اقسام کے پھل اور سبزیاں پیدا ہوتی ہیں اور کروڑوں کی تعداد میں طرح طرح کے مویشیوں سے کھانے پینے کی گوناگوں چیزیں حاصل کی جاتی ہیں— اس لحاظ سے ہمارا ملک پھلوں کے رس، گودے، آم، امرود انناس، انگور، ناشپاتی سے بنے مرکبات اور اضافی مالیت کی سبزیوں کی بخوبی برآمدکاری کرسکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ملک نے تسلی بخش صلاحیت حاصل کرلی ہے۔ پھلوں پر مبنی الکحل اور غیر الکحل مشروبات اور سافٹ ڈرنک کی عالمی منڈی میں کافی مانگ ہے۔

کیریئر کے مواقع: فوڈ ٹیکنالوجسٹ کو مختلف تنظیموں میں منافع بخش روزگار کے وافر مواقع حاصل ہوسکتے ہیں۔ ان میں سرکاری کوآپریٹو ادارے اور کثیر قومی کمپنیاں شامل ہیں۔

سرکاری تنظیمیں: فوڈ ٹیکنالوجسٹس کو ایف سی آئی، بینکنگ سروسیز، مختلف تدریسی اور تحقیقی تنظیموں، بی آئی ایس، ایگمارک اے ایم یو ایل وغیرہ میں خاطر خواہ روزگار دستیاب ہونے کے کافی امکانات ہیں۔

نجی اور کثیر قومی کمپنیاں: کیڈبری، پیپسی، کوکا کولا، نیسلے، جی ایس کے ڈابر میلس انڈیا لمیٹڈ، گلیکسو انڈیا لمیٹڈ، برٹینیا، روچی فوڈ، ماڈرن فوڈ انڈیا لمیٹڈ، واڈی لال، کوالٹی والس، میکڈونلڈ، نرولاز، ایچ ایل ایل، آئی آئی سی، اسلیٹ فوڈ کوآپریٹو فیڈریشنز، ہلدی رام، ہوٹل اور اسپتال، الکوہلک اور بیوریج انڈسٹریز۔ اس فہرست کو حتمی فہرست کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ کئی مینوفیکچرنگ اکائیاں بھی مارکیٹنگ ہاؤسیز سے سیدھا تجارتی ربط و ضبط قائم کرسکتی ہیں۔

تنخواہ اور دیگر مراعات: فوڈ ٹیکنالوجسٹ کے لیے ابتدائی سطح سے اعلیٰ

ترین مدارج تک روزگار کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ ان کے فرائض منصبی میں پروڈکشن، کوالٹی کنٹرول، مارکیٹنگ اور ترسیل سے متعلق تمام سرگرمیاں کو سنبھالنا اور ذمے داریوں کا نظم شامل ہوتا ہے۔ امیدوار کی تعلیمی لیاقت، تجربہ اور اس انسٹی ٹیوٹ کی جہاں سے اس نے فوڈ ٹیکنالوجی کورس کیا ہو، شہرت اور ناموری کے لحاظ سے 5000 روپے سے 30,000 روپے ماہانہ تنخواہ حاصل ہوسکتی ہے۔

فوڈ ٹیکنالوجی کورسوں کی پیشکش کرنے والے اداروں کی فہرست:

کالج، انسٹی ٹیوٹ	کورس	ویب سائٹ
سی ایف ٹی آر آئی میسور (کرناٹک)	ایم ایس سی (فوڈ ٹیکنالوجی) اور پی ایچ ڈی	www.oftri.com
آئی آئی ٹی، کھڑگپور (مغربی بنگال)	ایم ٹیک اور پی ایچ ڈی	www.iitkhaa-rag.org
جی بی پی اے ٹی یو (پنت نگر)		www.gropaut.nic.in
ایچ بی ٹی آئی کانپور (یوپی)	ایم ٹیک اور بی ٹیک	
جی این ڈی یو امرتسر (پنجاب)	بی ٹیک اور ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی	www.gndu.ernet.in
سنت لونگووال انسٹی ٹیوٹ آف فوڈ اینڈ ٹیکنالوجی لونگووال، سنگرور (پنجاب)	بی ٹیک اور ایم ٹیک	
سی سی ایس ایچ یو اے، حصار (ہریانہ)	ایم ایس سی فوڈ ٹیکنالوجی	www.hau.in
سی سی ایس یو، میرٹھ (یوپی)	ایم ایس سی فوڈ ٹیکنالوجی	www.ccsu.in
گرو جمبھیشور یونیورسٹی حصار (ہریانہ)	ایم ایس سی فوڈ ٹیکنالوجی	
عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (اے پی)	ایم ایس سی فوڈ ٹیکنالوجی	www.osmania.tech.ac.in
بندیل کھنڈ یونیورسٹی، جھانسی، (یوپی)	بی ٹیک اور ایم ایس سی فوڈ ٹیکنالوجی	www.bundelkhanduniversity.org
اے اے آئی ڈی یو (یوپی)	بی ٹیک اور ایم ایس سی فوڈ ٹیکنالوجی	www.aaidu.org.in
یونیورسٹی آف الہٰ آباد (یوپی)	ایم ایس سی فوڈ ٹیکنالوجی	
جیواجی یونیورسٹی گوالیار (ایم پی)	ایم ایس سی فوڈ ٹیکنالوجی	www.jiwaji.edu
شہید راج گرو کالج آف اپلائیڈ سائنسز فار ویمن، وویک وہار (دہلی)	بی اے یس سی فوڈ ٹیکنالوجی	www.rajgurucollege.org
بھاسکر آچاریہ کالج آف اپلائیڈ سائنسز نئی دہلی	بی اے ایس سی فوڈ ٹیکنالوجی	

ہندوستان کی فوڈ انڈسٹری کے بارے میں اعداد و شمار

مد	مالیت (روپے)
بازار	1248 ارب
معیشت میں اہمیت	مجموعی قومی پیداوار 6.3
برآمدات	24 ارب
اندرون ملک کھپت	1008 ارب
ڈبہ بند خوراک	366 ارب (اس میں 336 ارب صرف اندرون ملک ضروریات کے لیے)

ہندوستان کی ڈبہ بند (پیکیجڈ) فوڈ انڈسٹری

شعبہ	مالیت (روپے)
ڈبہ بند خوراک (گھریلو بازار)	336 ارب

بنیادی اشیا (اجناس و خوردنی تیل)	48ارب
ڈیری پروسیسنگ	24ارب
بکری اور کیولیزی (پکانے کے قابل اشیا)	77ارب
الکحل عرقیات و مشروبات	39.2ارب
دالیں	48ارب

ہندوستان میں خوراک کے استعمال کا انداز

خرچ کی مدیں	**روپے**
خوراک پر اندرون ملک خرچ	6270ارب
پروسیس کی گئی خوراک کا شعبہ	1262.4 ارب
فی کس خرچ/سالانہ	6720ارب

فوڈ ٹیکنالوجی کی تعلیم کا موجودہ تناظر:

فوڈ ٹیکنالوجی پروگرام کی کامیابی کے لیے بنیادی ڈھانچے کا مضبوط ہونا ضروری ہے۔ اس کے لیے ایسی تربیت یافتہ افرادی قوت بنیادی شرط ہے جسے عملی تربیت بھی دی گئی ہو۔ ہندوستان میں ہر سال اچھی خاصی تعداد میں فوڈ ٹیکنالوجسٹ تیار ہوتے ہیں۔ سی ایف ٹی آر آئی میسور کو خوراک پر تحقیق اور اس کی تعلیم کے بارے میں رہبر تنظیم کی حیثیت حاصل ہے۔ کئی ریاستی/مرکزی زرعی اور عام یونیورسٹیوں نے بھی بی ٹیک/بی ایس سی ایم ٹیک/ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی سطح پر فوڈ ٹیکنالوجی پروگرام شروع کیے ہیں تاکہ خوراک کی صنعت کی ضروریات کو پورا کیا جاسکے۔

داخلے کا طریقہ: مختلف یونیورسٹیوں میں امیدوار کا داخلہ میرٹ اور داخلہ امتحان کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ سی ایف ٹی آر آئی اپنے طور پر داخلہ امتحان لیتی ہے۔ پی جی سیٹوں میں سے 25 سیٹیں آئی سی اے آر کے زیر اہتمام کل ہند سطح پر منعقدہ داخلہ امتحان کی بنیاد پر پُر کی جاتی ہیں۔

اہلیت: بی ٹیک/بی ایس سی میں داخلے کے لیے سائنس (پی سی ایم بی) کے ساتھ 10+2 ایم ٹیک پروگرام کے لیے بی ٹیک (فوڈ ٹیکنالوجی) اگریکلچر/کیمیکل انجینئرنگ اور ایم ایس سی فوڈ ٹیکنالوجی میں داخلے کے لیے بی ایس سی (پی سی ایم/لائف سائنس/بی ایس سی (اگریکلچر/کیمیکل انجینئرنگ اور ایم ایس سی فوڈ ٹیکنالوجی میں داخلے کے لیے بی ایس سی (پی سی ایم/لائف سائنس/بی ایس سی (اگریکلچر/فوڈ ٹیکنالوجی) وغیرہ لازمی ہیں۔ بی ٹیک چار سالہ کورس ہوتا ہے جبکہ بی ایس سی (فوڈ ٹیکنالوجی) تین سالہ اور ایم ٹیک/ایم ایس سی (فوڈ ٹیکنالوجی) دو سالہ پروگرام میں عام یونیورسٹیاں اپنے طور پر داخلہ امتحان لیتی ہیں۔

فوڈ پروسیسنگ کی حیثیت

ہندوستان دودھ پیدا کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے یہاں 8.80 کروڑ ٹن دودھ پیدا ہوتا ہے۔ سبزیوں کی پیداوار کے لحاظ سے اول اور پھلوں کی پیداوار میں دوئم مقام رکھتا ہے۔ جغرافیائی علاقہ کے لحاظ سے ہندوستان کا مجموعی قابل کاشت علاقہ دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ صرف ہندوستان میں دنیا میں آم کی پیداوار کا نصف سے زیادہ حصہ پیدا ہوتا ہے۔ ہندوستان کو گوبھی، پیاز، چاول اور گنے کی پیداوار کے معاملے میں دیگر ممالک پر سبقت حاصل ہے۔ ہندوستان گنا، سیب، ناریل، سنگترے، آلو، سرسوں، تمباکو اور گیہوں پیدا کرنے والا ایک اہم ملک ہے۔ اس کو الائچی، ادرک، پودینہ اور ہلدی کی پیداوار میں بھی ایک قابل لحاظ مقام حاصل ہے۔ ملک کے 65 فیصد محنت کش طبقہ کی زراعت سے روزی و روزگار حاصل ہوتا ہے۔ ملک کی مجموعی قومی پیداوار کا تقریباً 33 فیصد زراعت سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی تقریباً 10 فیصد برآمدات زرعی اشیا پر مشتمل ہوتی ہیں۔

اختتام:

مناسب ٹیکنالوجی کا معقول اور نئے انداز میں استعمال کرنے سے کم لاگت پر اعلیٰ معیاری اشیا تیار کرنے میں مدد ملے گی جبکہ پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ صنعت کے بندوبست کے ذریعے اس کے انسانی اور مالی وسائل کو بہتر سے بہتر طریقے سے بروئے کار لانے کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی خوراک کی صنعت کو اپنی مصنوعات کا معیار بلند کرنے، نئی نئی اقسام کی اشیا تیار کرنے، شدید ماحولیاتی کیفیت اور مزدوروں اور دیگر اہل صرف کے پیشہ ورانہ تقاضوں کو پورا کرنے، مقررہ وقت اور طریقے سے ڈلیوری کو انجام دینے اور تیزی و چستی سے اپنے آپ کو نئے سانچے اور ڈھانچے میں ڈھالنے کی لچیلی صلاحیت پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اندرون ملک شدید مقابلہ آرائی، ترقی یافتہ صنعتی ممالک سے درآمد کی گئی بہتر معیار کی لیکن سستی مصنوعات ہماری اقتصادی ترقی کے لیے ایک چیلنج ہیں جس کا ہمیں پامردی سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ اسی میں ہماری ترقی، خوشحالی اور ابھرتی ہوئی عالمی طاقت بننے کا راز مضمر ہے۔

(بشکریہ "روزگار سماچار" نئی دہلی 2 تا 8 جولائی 2008)

□□□

پنیت نیر، استوتی تریہان، سمرات شرما

"C ایڈونچر" سے اقتباس

ارتھمیٹک آپریٹرز اور اسٹینڈرڈ ان پٹ آؤٹ پٹ

4.1 ارتھمیٹک آپریٹرز

اسائمنٹ آپریٹر

جب آپ کوئی ویریبل (Variable) ڈکلیر کرتے ہیں تو آپ کمپیوٹر میموری میں ایک سلاٹ (slot) محفوظ کر لیتے ہیں اس ویلیو کے لیے جسے ویریبل نام دیتا ہے۔ اور جو آپریٹر کے ذریعے (assign) کر کے کیا جائے گا۔

مثلاً ;x=1 میں سلاٹ x کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے اور اس میں ویلیو 1 کو رکھ دیتا ہے۔ اسائمنٹ آپریٹر بنیادی طور پر اس ویلیو کو اسٹور کر لیتا ہے جسے آپ میموری میں ویریبل کو اسائن کرنا چاہتے ہیں۔

ارتھمیٹک آپریٹرز

C پروگرامنگ میں آپ کو مستقل ارتھمیٹک آپریٹروں کا استعمال کرنا ہے۔ یہ تعداد میں پانچ ہیں۔

+ Addition
- Subtraction
* Multiplication
/ Division
% Modulus

مذکورہ بالا میں سے چار عدد تو عام ہیں لیکن ایک غیر مانوس آپریٹر (%) modulus ہے اسے ریمینڈر آپریٹر بھی کہا جاتا ہے۔

فرض کیجیے آپ کے پاس ;x = a % b تھا۔ یہ کمپیوٹر سے یہ معلوم کرنے کو کہے گا کہ b کتنی مرتبہ a میں جاتا ہے اور x کے لیے ریمینڈر کو x اسائن کرتا ہے۔

اس لیے x = 9 % 4, x کو 1 اسائن کرتا ہے کیونکہ 4 دو بار 9 ہو جاتا ہے اور 1 بچ جاتا ہے۔

آپریٹر کو مرتب کرتے وقت خیال رکھیں کہ ملٹی پلیکیشن (ضرب)، ڈیویزن (تقسیم) اور ماڈولس کو پہلے کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایڈیشن (جوڑ) اور سبٹریکشن (گھٹاؤ) کو کیا جاتا ہے۔ اپنے کامن سنس کا استعمال کیجیے جب بریکیٹ کو شامل کیا جائے گا تو اس میں موجود چیزوں ضرب سے پہلے کام کیا جائے گا۔

ارتھمیٹک اسائمنٹ آپریٹرز

آپ کوڈ کو آسان بنانے کے لیے ارتھ میٹک آپریٹرز اور اسائمنٹ آپریٹر کو ساتھ ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔

جس کی مثال درج ذیل ہیں:

```
x += y;          is the same as saying          x = x + y;
x -= y;          is the same as saying          x = x - y;
x *= y;          is the same as saying          x = x * y;
x /= y;          is the same as saying          x = x / y;
x %= y;          is the same as saying          x = x % y;
```

● نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کمیونیکیشن اینڈ انفارمیشن ریسورسیز سی۔ایس۔آئی۔آر یونٹ نے طلبہ اور عام شائقین میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے "سب کے لیے آئی ٹی سیریز" کے تحت ایسی کتابیں تیار کی ہیں جو کمپیوٹر سے متعلق بنیادی باتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ قارئین "اردو دنیا" کے لیے اس سیریز کی کتاب ""C" ایڈونچر" سے اقتباس پیش ہے۔ اس کتاب کے ایڈیٹر وی۔کے۔گپتا، معاون ڈاکٹر راجیو گپتا اور اردو ایڈیٹر ڈاکٹر رویندر کمار ہیں۔

پھر خاص طور سے x*=y; کا خیال رکھیں۔
مثال کے طور پر x*=y+z برابر ہے x=x*(y+z) کے، لیکن x=(x*y)=z کے برابر نہیں ہے۔

انکریمنٹ اور ڈکریمنٹ آپریٹرس

اگر آپ ایک انٹیجر ویریبل کو ڈکلیر کر رہے ہیں (مثلاً x) تو اس میں ایک کا انکریمنٹ x++ پوسٹ انکریمنٹ) یا (پری انکریمنٹ) ++x لکھ کر کر سکتے ہیں۔

اسی طرح آپ -x یا x- کے ذریعے ڈکریمنٹ کر سکتے ہیں۔

اگر آپ y =x++; جیسا کوئی اسائمنٹ دیں گے تو y کی ویلیو x کے برابر ہوگی ایک بڑھانے سے پہلے اور اگر آپ کو x میں ایک بڑھانا ہے y کو اسائن کرنے سے پہلے تو آپ کو پری انکریمنٹ آپریٹر استعمال کرنا ہوگا۔

چنانچہ میرے اس قول کا ثبوت ان مثالوں سے دیکھیں:

```
#include.stdio.h.
int main()
{
int a,b,x;
x = 23;
a = x++;
b = x;
printf("The values of a and b are %d and %d\n %n", a,b);
return 0;
}
```

4.2 اسٹینڈرڈ ان پٹ اور آؤٹ پٹ

جب آپ یوزرس سے ان پٹ ویلیو اور اسکرین پر آؤٹ پٹ ویلیو کے بارے میں سوچیں تو سورس کوڈ کے اوپری حصے میں موجود ہیڈر فائل میں stodio.h کو ضرور شامل کریں۔ (stdio.h کا مطلب Standard Input & output کے لیے لایا جاتا ہے) جتنے پروگرام میں نے لکھے ہیں ان میں کچھ پوائنٹ میں ان پٹ اور آؤٹ پٹ output ویلیو ہے اس لیے مجھے ہمیشہ اپنے سورس کوڈ کو اوپری حصے میں include<stdio.h> # لکھنا پڑا۔

ڈکلیرنگ ویریبلس

اس سے قبل کہ آپ ان پٹ input اور آؤٹ پٹ ویلیو دینا شروع کریں ویریبلس کا سورس کوڈ میں استعمال سے پہلے ڈکلیر کرنا لازمی ہے۔ ویریبل کو ڈکلیر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ڈیٹا ٹائپ کو واضح کریں، ویریبل کو نام دیں اور آخر میں سیمی کولن لگائیں۔ جب آپ ویریبل کو ڈکلیر کرتے ہیں تو کمپیوٹر کی کچھ میموری مخصوص ہو جاتی ہے۔ تاکہ ویریبل کی ویلیو کو میموری سلاٹ میں محفوظ کیا جا سکے۔

ویریبل ڈکلریشن کی کچھ مثالیں یوں ہیں:

```
char a;
char beta;
int x, y, z; /* You can declare more than one variable of the same type on one line! */
float pi = 3.142; /* You can also assign a value to the variable like this! */
double root2 = 1.414213562373;
```

C میں main() کے شروع ہونے سے پہلے تمام ویریبل کو ڈکلیر کریں۔ نہ کہ فنکشن کو کال کرنے کے بعد یہ اصول C++ کمپائلر کے نہیں ہیں کیونکہ میں سورس کوڈ کو ".c" extension ایکسٹینشن کے ساتھ محفوظ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کوڈ کا یہ حصہ غلطیوں کو دکھا سکتا ہے:

```
#include .stdio.h>
int main()
{int x = 5;
printf("x = %d/n", x);
int y = 4; /* "declaration is not allowed here" , says my compiler */
printf("y = %d\n",y);
return 0;
}
```

ویلیوز کا ان پٹ کرنا

ویلیو کو ان پٹ کرنے کا آسان طریقہ ہے scanf() فنکشن کا استعمال حالانکہ getc() اور getchar() میں دیگر فنکشن بھی ہیں مگر مجھے scanf() کا استعمال سب سے آسان لگا scanf() کو کیسے استعمال کیا جاتا ہے اس کی مثال

```
scanf("%d", &x(;
```

جب بھی یوزر کوئی انٹیجر ٹائپ کرے انٹر دباتا ہے تو ٹائپ کی ویلیو اس میموری سلاٹ میں اسٹور ہوجاتی ہے تو x کے لیے مخصوص ہے x سے پہلے استعمال ہونے والا '&x' میموری سلاٹ کا ایڈرس ہوتا ہے۔

'%d' فارمیٹ اکسی فائر کہلاتا ہے۔ کئی طرح کے فارمیٹ اسپیس فائرز ہیں۔ یوزر کی طرف سے ان پٹ کے لحاظ سے کوئی خاص اکسی فائر استعمال کیا جاتا ہے۔ مانا کہ ہم ایک انٹیجر انٹر کرنا چاہتے ہیں۔ ذیل میں کچھ فارمیٹ اکسی فائرز دیے گئے ہیں۔

%c	character format specifier
%d	integer format specifier
%f	float and double format specifier
%s	string format specifier

آپ بیک وقت ایک سے زائد ویلیو ان پٹ کر سکتے ہیں۔ دیکھیں کہ مندرجہ لائن کیا کرتی ہے:

```
scanf("%c %d %d, &x, &y, &z),
```

مان لیں کہ x, y اور z ویریبلز کو حسب ترتیب (char, int) اور (int) ڈکلیر کیا گیا ہے یوزر ایک (space) چھوڑ کر تین ویلیو ان پٹ نوٹ کریں کہ فارمیٹ اکسی فائرز کے گرد ڈبل کوٹ میں ہیں تو ("address of variables") کو ایک دوسرے کو کومہ کے ذریعے علیحدہ کیا گیا ہے۔

ویلیوز کا آؤٹ پٹ کرنا

ایک ویلیو کو آؤٹ پٹ کرنے کے لیے ہم ایک عام لائبریری فنکشن Printf() کا استعمال کرتے ہیں جس کی مثال درج ذیل ہیں:

```
printf("The value of x is %d/n", x);
```

کوٹس کے درمیان کا پورا متن (text) اسکرین پر پرنٹ ہوتا ہے اور فارمیٹ اکسی فائر کے پرنٹ ہونے کے بجائے x کی عددی ویلیو پرنٹ ہوجاتی ہے \n خاص کریکٹر ہے یعنی نیو لائن کریکٹر اس کا کام وہی ہے جو ورڈ پروسیسر میں انٹر کا کام ہوتا ہے۔ اگر پروگرام کو ایک اور لائن پرنٹ کرنی ہو تو یہ اگلی لائن ہوتی نوٹ کریں کہ نیو لائن کریکٹرز ڈبل کوٹ مارکس کے درمیان ہے۔

اگر آپ پرسنٹیج کے اشارے کو پرنٹ کرنا چاہتے ہیں تو Printf میں %% کو ٹائپ کرنا ہوگا۔

درج ذیل کی مثال میں C میں دو انٹیجرس کو یوزر نے ان پٹ کیا ہے۔ جس کا نتیجہ آؤٹ پٹ ہے۔

```
#include ,stdio.h>     /*Don't forget to include the header file! */
int main()
{
int a, b, c;                          /*Declare variables */
printf("Enter two integers separated by a space");
printf("and I will work out therir sum!\n");
scanf("%d %d", &a, &b);
c = a + b;                            /* Work out the sum */
print("%d plus %d is equal to %d\n", a, b, c);        /* Print it out */
return 0;
}
```

%اس کوڈ کا آؤٹ پٹ 2 اور 3 کے داخلے کے بعد انٹر کرتا تھا۔

```
"Enter two integers separated by a space and I will work out their sum!
2 3
2 plus 3 is equal to 5"
```

printf میں ڈبل کوٹ کے اشارے والے میٹر میں کوڈ کے بند ہونے کے بعد کے ایکسپریشن کو دیکھا جا سکتا ہے۔ پہلا ایکسپریشن a کی ویلیو پہلے فارمیٹ اسپیسی فائر (format specifier) کے ذریعے سے پرنٹ کی جاتی ہے۔ (نیچے دیکھیے) حقیقت میں ہم پروگرام کو مزید بہتر بنا سکتے ہیں اگر c ویریبل کے بجائے ہم پرنٹنگ لائن کو اس طرح لکھیں۔

```
printf ("d plus d is equal to d/n", a, b, a+b) ;
```

تیر کا نشان یہ بتا رہا ہے کہ اب فارمیٹ اسپیسی فائر ایک ایکسپریشن کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

کم سے کم فیلڈز کی وسعت

فرض کیجیے کہ آپ ایک ایسے پروگرام کو ڈسپلے کر رہے ہیں جو اسکرین پر کم سے کم جگہ میں آجاتا ہے۔ آپ ایک انٹیجر ویلیو میں % پرسنٹ کے نشان کا اضافہ کرتے یا کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ کم از کم 8 اسپیس کا استعمال کر کے ایک انٹیجر کو ڈسپلے کرنا چاہتے ہیں تو printf میں 8d% کو لکھیں گے۔ جس کی مثال درج ذیل ہے۔

```
#include <stdio.h>
int main()
{
int x = 123;
printff("Printing 123 using %%0d displays %0d\n", x);
printff("Printing 123 using %%1d displays %0d\n", x);
printff("Printing 123 using %%2d displays %0d\n", x);
printff("Printing 123 using %%3d displays %0d\n", x);
printff("Printing 123 using %%4d displays %0d\n", x);
printff("Printing 123 using %%5d displays %0d\n", x);
printff("Printing 123 using %%6d displays %0d\n", x);
printff("Printing 123 using %%7d displays %0d\n", x);
printff("Printing 123 using %%8d displays %0d\n", x);
printff("Printing 123 using %%9d displays %0d\n", x);
return 0;
}
```

اگر آپ نے پروگرام کو کمپائل کر کے رن کریں گے تو یہ نظر آئے گا:

```
Printing 123 using %0d displays 123
Printing 123 using %1d displays 123
Printing 123 using %2d displays 123
Printing 123 using %3d displays 123
Printing 123 using %4d displays 123
Printing 123 using %5d displays 123
Printing 123 using %6d displays 123
Printing 123 using %7d displays 123
Printing 123 using %8d displays 123
Printing 123 using %9d displays 123
```

دیکھیں کہ پہلے چار کیسوں میں 123 بالکل اسی طرح ڈسپلے ہوا ہے جیسے کہ عام طور پر d% کے استعمال سے ہوتا ہے۔ کیوں؟ کیونکہ اسکرین پر ڈسپلے کرنے والی اسپیس کی تعداد 3 سے زائد یا 3 کے برابر ہے۔

لیکن اگر آپ 09d% لکھیں تو پروگرام نمبر کے پہلے کئی زیرو کو ڈسپلے کرے گا۔ نیچے کی مثال کو دیکھیے۔

```
Printing 123 using %09d displays 000000123
```

ڈسپلے کرے گا اس کا فائدہ یہ ہے کہ نمبر کی کم سے کم فیلڈ کا شمار کر سکتے ہیں۔

میکنگ اٹ کی نیٹر

مذکورہ مثال میں آؤٹ پٹ بہت صاف نہیں ہے کیونکہ نمبر داہنی طرف کی منظم فیلڈ سے متعلق ہیں۔ دوسرے لفظوں میں 2،1 اور 3 داہنی طرف کی کمترین فیلڈ کے تین اسپیس میں ہے جو ہم نے داخل کیا ہے۔

آؤٹ پٹ کو بائیں طرف کرنے کے لیے فارمیٹ اسپیسی فائر میں نمبر سے پہلے کا نشان لگانا ہوگا لیکن اگر آپ نے اسے گزشتہ مثالوں کے ساتھ انجام دیا تو آؤٹ پٹ پھر بھی وہی رہے گا۔

مثالوں کو کمپائل کرنے کی کوشش کریں:

```
#include <stdio.h>
int main()
{
int x = 12;
int y = 123;
int z = 12345;
printf("Printing 12 using %%9d \t\t displays %9d\n", x);
printf("Printing 12 using %%09d \t\t displays %09d\n", x);
printf("Printing 12 using %%9d \t\t displays %9d\n", x);
printf("Printing 12 using %%09d \t displays %09d\n", x);
printf("Printing 123 using %%9d \t\t displays %9d\n", y);
printf("Printing 123 using %%09d \t\t displays %09d\n", y);
printf("Printing 123 using %%-9d \t displays %-9d\n", y);
printf("Printing 123 using %%-09d \t\t displays %-09d\n", y);
printf("Printing 12345 using %%9d \t displays %9d\n", z);
printf("Printing 12345 using %%09d \t displays %09d\n", z);
printf("Printing 12345 using %%-9d \t displays %-9d\n", z);
printf("Printing 12345 using %%-09d \t displays %-09d\n", z);
return 0;
}
```

اس مثال کا آؤٹ پٹ یہ ہوگا۔

```
Printing 12 using %9d          displays  12
Printing 12 using %09d         displays  000000012
Printing 12 using %-9d         displays  12
Printing 12 using %-09d        displays  12
Printing 123 using %9d         displays  123
Printing 123 using %09d            displays  000000123
Printing 123 using %-9d            displays  123
Printing 123 using %-09d           displays  123
Printing 12345 using %9d           displays  12345
Printing 12345 using %09d          displays  000012345
Printing 12345 using %-9d          displays  12345
Printing 12345 using %-09d         displays  12345
```

ڈسپلے کرتے وقت آپ \t کو ٹیب کے لیے استعمال کر سکتے ہیں جس سے آؤٹ پٹ اور واضح ہو جائے گا۔

مزید باریکیاں

منیمم فیلڈ اکوسی فائر کے بعد انٹیجر کے بعد انٹیجر میں ڈوٹ لگا کر ڈسپلے کرنے میں مزید مہارت حاصل کر سکتے ہیں انٹیجر کے ساتھ والے ڈاٹ کو پری سیژن اکوسی فائر کہا جاتا ہے۔ ایک انٹیجر سٹرینگ () کو ڈسپلے کرانے کے لیے جو انٹیجر آپ نے داخل کیا ہے وہ میکسیمم فیلڈ تھ کہلائے گی۔

جب یہ 1 کے فلوٹینگ پائنٹ نمبر کی طرف جاتا ہے تو اس وقت ایسا ہوتا ہے جو کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ جب آپ فلوٹنگ پائنٹ نمبروں کے لیے فورمیٹ اکوسی فائر %f کا استعمال کر رہے ہیں تو آپ پریسیژن اکوسی فائر کا استعمال کر کے ڈسمل کی جگہوں کے نمبر کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔ جنھیں پہلے استعمال کیا گیا تھا جس کا ڈیفالٹ 6 ہے اور اب ڈوٹ کے بعد والا نمبر ڈسمل پلیس کا نمبر ہوگا اور ڈوٹ کے پہلے والا نمبر کم سے کم فیلڈ کی چوڑائی میں ہوگا۔

نیچے کی مثالوں پر غور کریں:

```
#include <stdio.h>
int main()
{
float x = 3.141592;
printf("Printing 3.141592 using %%f\t          displays %f\n", x);
printf("Printing 3.141592 using %%1.1f\t       displays %1.1f\n", x);
printf("Printing 3.141592 using %%1.2f\t       displays %1.2f\n", x);
printf("Printing 3.141592 using %%3.3f\t       displays %3.3f\n", x);
printf("Printing 3.141592 using %%4.4f\t       displays %4.4f\n", x);
printf("Printing 3.141592 using %%4.5f\t       displays %4.5f\n", x);
printf("Printing 3.141592 using %%09.3f        displays %09.3f\n", x);
printf("Printing 3.141592 using %%-09.3f       displays %-09.3f\n", x);
printf("Printing 3.141592 using %%9.3f         displays %9.3f\n", x);
printf("Printing 3.141592 using %%-9.3f        displays %-9.3f\n", x);
return 0;
}
```

اس کوڈ کا آؤٹ پٹ یہ ہے

```
Printing 3.141592 using %f              displays  3.141592
Printing 3.141592 using %1.1f           displays  3.1
Printing 3.141592 using %1.2f           displays  3.14
Printing 3.141592 using %3.3f           displays  3.142
Printing 3.141592 using %4.4f           displays  3.1416
Printing 3.141592 using %4.5f           displays  3.14159
Printing 3.141592 using %09.3f          displays  00003.142
Printing 3.141592 using %-09.3f         displays  3.142
Printing 3.141592 using %9.3f           displays  3.142
Printing 3.141592 using %-9.3f          displays  3.142
```

□□□

محمد فیروز

کوئز

اردو زبان وادب

کوئز کے صحیح جوابات بھیجنے والے قارئین کو بالترتیب پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام دیا جائے گا۔ پہلا انعام 500 روپے، دوسرا انعام 300 روپے اور تیسرا انعام 200 روپے پر مشتمل ہے۔ انعام کے طور پر کونسل کی مطبوعات ارسال کی جائیں گی۔ آپ کے جوابات ہمیں اس مہینے کی 15 تاریخ تک موصول ہو جانے چاہئیں۔ (ادارہ)

(1) محمد حسین آزاد نے کس زبان کو اردو کا سرچشمہ قرار دیا تھا؟

(الف) کھڑی بولی　(ب) برج بھاشا

(ج) پنجابی　(د) سنسکرت

(2) اردو میں کس زبان کے الفاظ بہت زیادہ ہیں؟

(الف) ترکی　(ب) عربی

(ج) فارسی　(د) ہندی

(3) اردو تذکروں میں کس کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں؟

(الف) تقریظ　(ب) آپ بیتی

(ج) تنقید　(د) خاکہ نگاری

(4) غالب کے خطوط کی نثر کیسی ہے؟

(الف) سادہ　(ب) رنگین

(ج) مقفیٰ　(د) مسجع

(5) الطاف حسین حالی کو کس نے اردو تنقید کا بانی کہا تھا؟

(الف) شبلی نعمانی　(ب) وحید الدین سلیم

(ج) مولوی عبدالحق　(د) کلیم الدین احمد

(6) "ادب اور نظریہ" کس نقاد کی تصنیف ہے؟

(الف) سید احتشام حسین　(ب) آل احمد سرور

(ج) سید اعجاز حسین　(د) مجنوں گورکھپوری

(7) محمد حسین آزاد کی تحریریں کس کا بہترین نمونہ ہیں؟

(الف) شاعرانہ تخیل　(ب) سادگی

(ج) انشا پردازی　(د) افسانہ نگاری

(8) امانت نے ڈراما "اندر سبھا" کب لکھا تھا؟

(الف) 1850　(ب) 1852

(ج) 1854　(د) 1855

(9) مرزا فرحت اللہ بیگ کی باقاعدہ ادبی زندگی کی ابتدا کب ہوئی؟

(الف) 1928　(ب) 1930

(ج) 1932　(د) 1935

(10) علامہ اقبال نے کس فارسی شاعر کو اپنا پیر بتایا ہے؟

(الف) سعدی شیرازی　(ب) حافظ شیرازی

(ج) عبدالقادر بیدل　(د) مولانا روم

(11) کس نے کہا تھا "پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں"؟

(الف) میر مونس　(ب) میر رئیس

(ج) میر حسن　(د) میر انیس

(12) "دبستان لکھنؤ" سے کس شاعر کا تعلق نہیں ہے؟

(الف) آتش　(ب) ناسخ

(ج) صفی　(د) شاہ نصیر

(13) اردو شعرا میں سب سے پہلے گیان پیٹھ انعام کس نے حاصل کیا؟

(الف) علی سردار جعفری　(ب) مجروح سلطانپوری

(ج) فراق گورکھپوری　(د) فیض احمد فیض

(14) "شاعر مزدور" کون ہے؟

(الف) نظیر اکبرآبادی　(ب) احسان دانش

(ج) کیفی اعظمی　(د) مجاز لکھنوی

(15) گاؤں کی زندگی پر کس افسانہ نگار نے زیادہ افسانے لکھے؟

(الف) سلطان حیدر جوش　(ب) کرشن چندر

(ج) پریم چندر　(د) راجندر سنگھ بیدی

(16) "زعفران کے پھول" کس کا افسانوی مجموعہ ہے؟

(الف) ذکی انور　(ب) سہیل عظیم آبادی

(ج) خواجہ احمد عباس　(د) غلام عباس

(17) ذیل میں سے کون سی کہانی سعادت حسن منٹو کی ہے؟

(الف) گڈریا　(ب) آنندی

(ج) بالکونی　(د) نیا قانون

(18) "ایک ادبی ڈائری" کس کی تصنیف ہے؟

(الف) احسن فاروقی　(ب) اختر انصاری

(ج) حسن عسکری　(د) وحید اختر

(19) "کلیات میراجی" کے مرتب کون ہیں؟

(الف) خلیل الرحمٰن اعظمی　(ب) اختر انصاری

(ج) اختر الایمان (د) جمیل جالبی

(20) نظم ''پرچھائیاں'' کے شاعر کا نام بتایئے؟

(الف) جاں نثار اختر (ب) فیض احمد فیض

(ج) ساحر لدھیانوی (د) شاذ تمکنت

(21) دیکھ کر میکدے پر ابر بہار
رند مفلس کی آنکھ بھر آئی
یہ مشہور شعر کس کا ہے؟

(الف) اختر شیرانی (ب) مجاز لکھنوی

(ج) ریاض خیر آبادی (د) شمیم کرہانی

(22) ''لسان العصر'' کس شاعر کا خطاب ہے؟

(الف) حسرت موہانی (ب) جگر مراد آبادی

(ج) اکبر الہٰ آبادی (د) جوش ملیح آبادی

(23) کس شاعر نے گل و بلبل کے مضامین سے اپنا دامن بچایا؟

(الف) نظم طباطبائی (ب) برج نرائن چکبست

(ج) سرور جہاں آبادی (د) جوش ملیح آبادی

(24) مثنوی ''قطب مشتری'' کس کی دریافت ہے؟

(الف) پروفیسر محمود شیرانی (ب) قاضی عبدالودود

(ج) مولوی عبدالحق (د) امتیاز علی عرشی

(25) اکبر الہٰ آبادی نے اپنے اشعار میں کس اردو ادیب کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا تھا؟

(الف) شبلی نعمانی (ب) عبدالحلیم شرر

(ج) سرسید احمد خاں (د) وحید الدین سلیم

(26) کس کا قول ہے کہ ''زبان کو شاعری اور شاعری کو زبان بنا دینا کوئی آسان کام نہیں؟

(الف) الطاف حسین حالی (ب) احتشام حسین

(ج) آل احمد سرور (د) رشید احمد صدیقی

(27) ''اردو شاعری پر ایک نظر'' کس کی تصنیف ہے؟

(الف) اعجاز حسین (ب) مسیح الزماں

(ج) کلیم الدین احمد (د) احتشام حسین

(28) اردو میں فرانسیسی ادب پر کس نے کتاب لکھی تھی؟

(الف) مسعود حسین خاں (ب) یوسف حسین خاں

(ج) عابد حسین (د) محمد مجیب

(29) کس ادیب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز پیروڈی سے کیا تھا؟

(الف) غلام احمد فرقت (ب) شوکت تھانوی

(ج) کنہیا لال کپور (د) ابراہیم جلیس

(30) پطرس بخاری کس لیے مشہور ہیں؟

(الف) صحافت (ب) طنز و ظرافت

(ج) سوانح نگاری (د) خاکہ نگاری

(31) ''سی پارۂ دل'' کس کے انشائیوں کا مجموعہ ہے؟

(الف) سجاد انصاری (ب) خواجہ حسن نظامی

(ج) رشید احمد صدیقی (د) اشرف صبوحی

(32) حیات اللہ انصاری کس اردو اخبار کے مدیر تھے؟

(الف) ہمدرد (ب) زمیندار

(ج) انقلاب (د) قومی آواز

(33) ''اور بنسری بجتی رہی'' کس کی تصنیف ہے؟

(الف) اوپندر ناتھ اشک (ب) دیویندر ستیارتھی

(ج) احمد جمال پاشا (د) فکر تونسوی

(34) فانی نے ..... شاعری کو فلسفیانہ بلندی تک پہنچایا؟

(الف) قنوطی (ب) عشقیہ

(ج) صوفیانہ (د) حکیمانہ

(35) ''غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
اس شعر میں کون سی صنعت ہے؟

(الف) تجاہل عارفانہ (ب) حسن تعلیل

(ج) مکر شاعرانہ (د) ایہام

(36) غالب نے سرسید کی کس کتاب پر تقریظ لکھی تھی؟

(الف) آثار الصنادید (ب) آئین اکبری

(ج) اسباب بغاوت ہند (د) خطبات احمدیہ

(37) حاجی بغلول کا کردار کس نے وضع کیا تھا؟

(الف) رتن ناتھ سرشار (ب) سجاد حسین

(ج) نیاز فتح پوری (د) مرزا ہادی رسوا

(38) ڈراما ''آگرہ بازار'' کے ڈراما نگار کا نام بتایئے؟

(الف) امتیاز علی تاج (ب) محمد حسن

(ج) صفدر ہاشمی (د) حبیب تنویر

(39) پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ کس عنوان سے شائع ہوا تھا؟

(الف) دنیا کا سب سے انمول رتن (ب) سوز وطن

(ج) پریم پچیسی (د) خاک پروانہ

(40) کس شاعر کے نعتیہ قصیدے میں سب سے زیادہ ہندوستانی تلمیحات، رسم و رواج اور ہندی الفاظ ہیں؟

(الف) منیر شکوہ آبادی (ب) محسن کاکوروی

(ج) آغا شاعر (د) جگر مرادآبادی

(41) "توبۃ النصوح" تاریخی ترتیب کے اعتبار سے نذیر احمد کا کون سا ناول ہے؟

(الف) پہلا (ب) دوسرا

(ج) تیسرا (د) چوتھا

(42) ذیل میں سے کون سی کتاب عبدالرحمٰن بجنوری کی ہے؟

(الف) اطراف غالب (ب) تفہیم غالب

(ج) مطالعہ غالب (د) محاسنِ کلام غالب

(43) "تمثیل نگاری" کے لیے کون سی کتاب زیادہ مشہور ہے؟

(الف) بوستانِ خیال (ب) سب رس

(ج) عجائب القصص (د) کربل کتھا

(44) بحیثیت محقق کون زیادہ مشہور رہا؟

(الف) نصیر الدین ہاشمی (ب) قاضی عبدالودود

(ج) کلیم الدین احمد (د) وزیر آغا

(45) "سرخ سویرا" کس کا مجموعۂ کلام ہے؟

(الف) علی سردار جعفری (ب) احمد ندیم قاسمی

(ج) کیفی اعظمی (د) مخدوم محی الدین

(46) میر تقی میر کے ہم عصر شاعر کا نام بتایئے؟

(الف) امیر مینائی (ب) میر انیس

(ج) خواجہ میر درد (د) صدرالدین آزردہ

(47) ناول "علی پور کا ایلی" کس نے لکھا تھا؟

(الف) شوکت صدیقی (ب) عبداللہ حسین

(ج) ممتاز مفتی (د) اختر اورینوی

(48) درج ذیل شعرا میں خالص نظم گو شاعر ہے؟

(الف) احمد فراز (ب) اختر الایمان

(ج) فیض احمد فیض (د) علامہ اقبال

(49) "دلی کی آخری شمع" طویل مضمون کس نے لکھا تھا؟

(الف) میر ناصر علی (ب) ملا واحدی

(ج) فرحت اللہ بیگ (د) شاہد احمد دہلوی

(50) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو کس سن میں یونیورسٹی کا درجہ ملا؟

(الف) 1918 (ب) 1920

(ج) 1925 (د) 1928

ہمیں نومبر کوئز انعامی مقابلے کے متعدد صحیح جوابات موصول ہوئے۔

قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل حضرات کو بالترتیب اوّل، دوم اور سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

1. **محمد نوشاد عالم**

247، سابرمتی ہاسٹل، جے. این. یو. نئی دہلی-110067

2. **سنجر ہلال بھارتی**

(اینگلو پرشین ڈپارٹمنٹ کلکتہ مدرسہ)
21، حاجی محمد محسن اسکوائر، کولکاتہ-700016 (مغربی بنگال)

3. **زرقا رحمٰن**

معرفت علامہ اقبال ماڈرن پبلک اسکول
محلّہ میاں سرائے، سنبھل، ضلع مرادآباد، یوپی-244302

انعام یافتگان کو ادارے کی جانب سے مبارک باد۔

آپ کے انعامات جلد ہی بذریعۂ ڈاک ارسال کر دیے جائیں گے۔

(ادارہ)

نومبر انعامی مقابلے (کوئز) کے صحیح جوابات:

1. الف 2. ج 3. ج 4. ب 5. ب
6. ب 7. ب 8. ب 9. ج 10. ب
11. ب 12. ب 13. ب 14. ب 15. ب
16. ب 17. ب 18. د 19. الف 20. ب
21. ب 22. ج 23. ج 24. ج 25. د
26. ب 27. ج 28. ج 29. ج 30. ب
31. ب 32. ج 33. د 34. د 35. ب
36. ب 37. د 38. د 39. ج 40. ب
41. ب 42. د 43. ب 44. ب 45. ب
46. الف 47. ج 48. د 49. ج 50. ب

روبینہ ناز

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-29

بڑھتے قدم

تفسیر احمد نے، جن کے والد محترم ایس. ایم. شفیق ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازمت کرتے ہیں، بارھویں تک کی تعلیم ایک سرکاری اسکول میں حاصل کی۔ اس کے بعد کالج جوائن کیا اور بی. اے. کرنے کے بعد انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ایک سال کا ڈپلوما اِن کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی. ٹی. پی. کورس کیا اور ابھی ایک پرائیویٹ ادارے میں نوکری کررہے ہیں۔ ان کا مختصر انٹرویو قارئینِ ”اردو دنیا“ کے لیے پیش ہے۔

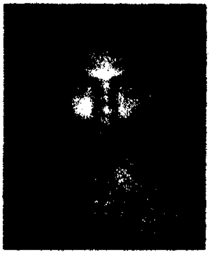

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: پرانی سنسکرتی ختم ہونے اور نئی سنسکرتی کے وجود میں آنے سے کمپیوٹر سے دلچسپی ہونا لازمی ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ میرے لیے انمول تحفہ ہیں۔ 1997 میں جب کمپیوٹر پر اردو کتابت کا کام بہت تیزی سے ہونے لگا تو میرے اندر کمپیوٹر سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ تین مہینے ٹائپنگ سیکھنے کے بعد میں نے کمپیوٹر کا کورس کیا۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: پہلی بات تو یہ کہ یہاں اردو سکھائی جاتی ہے جبکہ دوسرے سینٹروں میں یہ سہولیات دستیاب نہیں ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ قومی اردو کونسل اردو کی ترقی و ترویج اور اقلیتوں کی فلاح و بہبود کی ذمے دار ہے۔ یہاں سے ڈپلوما کرنا روشن امکانات کا ضامن ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جارہی ہے، اُس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: پوری طرح مطمئن ہوں کیونکہ یہاں سے کورس کرنے کے بعد مجھے بھی ایک پرائیویٹ ادارے میں نوکری ملی ہے اور وہ بھی کمپیوٹر آپریٹر کی۔ بھلے ہی تنخواہ کم ہے لیکن مجھے اچھی نوکری کے لیے تجربہ تو حاصل ہو رہا ہے۔ میں یہاں کے اساتذہ اور قومی اردو کونسل کا مشکور و ممنون ہوں۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اُردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: اس دور میں نوکری تلاش کرنا کسی بھی میدان میں بہت مشکل کام ہے اور نوکری ملنا تو تقریباً ناممکن ہے لیکن اس کورس میں اردو سافٹ ویئر کے ساتھ ساتھ ڈیزائننگ وغیرہ کی وجہ سے کام کرنے اور روزگار تلاش کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: بہت اچھا لگ رہا ہے میری خواہش ہے کہ میں کمپیوٹر اور اردو کی مناسبت سے کوئی انوکھا کام کروں جس سے نوجوان طبقہ مستفید ہوسکے، کمپیوٹر مجھے اپنا بہت قریبی دوست لگتا ہے۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: خود اعتمادی و خود انحصاری میں کافی حد تک اضافہ ہوا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے مجھے نوکری حاصل کرنے کا موقع ملا ہے اور اس کی وجہ سے میں اپنے والد کا بوجھ کچھ حد تک کم کرسکا ہوں۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: ملٹی لنگول ہونے کی وجہ سے میں اردو، ہندی، انگریزی میں کام کرسکتا ہوں۔ مجھے مارکیٹ میں کوئی بھی نوکری اور کسی بھی زبان میں کام کرنے میں کوئی دشواری نہیں آئے گی۔ میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس زبان پر کمپیوٹر میں مہارت حاصل ہے۔ مجھے فطری طور پر اس کا فائدہ حاصل ہوگا اور احساسِ کمتری کا شکار ہونے سے بچ جاؤں گا۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہ تھی؟

جواب: بظاہر کورس کے حساب سے دیکھا جائے تو فیس مناسب ہے لیکن بہت سے طلبہ ایسے ہوتے ہیں جنھیں فیس ادا کرنے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور انھیں یہ فیس بوجھ لگتی ہے۔

* * *

اردو خبرنامہ

پریم چند پر بین الاقوامی مذاکرہ

● نئی دہلی، 27 اکتوبر۔ منشی پریم چند جدید ہندوستان کے عظیم ترین ادیبوں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے ہندی اور اردو زبانوں میں لکھا اور دونوں ہی زبانوں میں ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے اعلیٰ ترین مقام حاصل کیا۔ ساہتیہ اکادمی کے صدر اور ممتاز نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے منشی پریم چند کی 125 ویں سالگرہ کے موقعے پر ساہتیہ اکادمی کی طرف سے منعقدہ چار روزہ عالمی سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ بلاشبہ منشی پریم چند نے حق و انصاف اور سماجی خدمات کے آدرش بھی تراشے تھے۔ ان کے کئی کردار گاندھی وادی فکر سے آراستہ ہیں۔ بنگلہ ادیب شرت بابو کی طرح حقیقت نگاری پریم چند کو وراثت میں نہیں ملی۔ اس کے لیے انھوں نے خود زمین صاف کی، خود بیج ڈالا اور خود فصل اگائی۔ جن بنیادوں پر ہندی اردو کہانی اور ناول کا محل سجایا گیا ہے وہ بنیادیں پریم چند کی ہی رکھی ہوئی ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو کرشن چندر، منٹو، بیدی اور عصمت کو کرشن چندر، منٹو، بیدی اور عصمت بننے کے لیے شاید ایک جنم اور انتظار کرنا پڑتا۔

اپنے تعارفی خطبے میں ساہتیہ اکادمی اگزیکیٹو بورڈ کے رکن گری راج کشور نے کہا کہ پریم چند کا وارث ہر مزدور، ہر کسان اور ہر غریب انسان ہے۔ ان کی تخلیقات سے ہر آدمی اپنی ادبی بھوک مٹا سکتا ہے۔ معروف افسانہ نگار راجندر یادو نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آج پریم چند کو متنازع ادیب بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ان کی زبان اور سوچ کو سطحی کہا جا رہا ہے۔ پریم چند کو جاگیردارانہ تہذیب کا منشی بھی کہا جا رہا ہے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر انھیں جاننا اور سمجھنا اور ضروری ہو گیا ہے۔ راجندر یادو کے مطابق ناانصافی اور مظالم کے خلاف جدوجہد کا نام پریم چند ہے۔ اپنے کلیدی خطبے میں ممتاز ہندی ناول نگار کملیشور نے کہا کہ اگر ہم پریم چند کو ان کی 125 ویں سالگرہ کے موقعے پر یاد کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ عظیم فنکار تھے۔ پریم چند نے جاگیردارانہ ماحول میں غریبوں کی بات کی۔ پریم چند کے پوتے پروفیسر آلوک رائے نے اپنی تقریر میں پریم چند کے اردو متن اور ہندی متن کے تقابلی جائزے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس موقعے پر کرشنا سوبتی اور کیلیفورنیا (امریکہ) سے تشریف لائے کرسٹوفر کنگ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس سیمینار کے پہلے اجلاس کا موضوع ''پریم چند اور ہم عصر سیاست'' تھا جس کی صدارت ہندی کے معروف نقاد و ادیب پروفیسر منیجر پانڈے نے کی۔ رام وچن رائے، ہریش ترویدی اور وینو گوپال نے اپنے مقالوں کے ذریعے پریم چند کے عہد کی سیاست اور معاشرے پر اس کے اثرات پر روشنی ڈالی۔ دوسرے اجلاس میں ''دلت ڈسکورس اور پریم چند'' کے موضوع پر چمن لال، موہن داس نیمی شرائے اور سورج پال چوہان نے مقالات پیش کیے۔ صدارت نتیانند تیواری نے کی۔ شام کو سات بجے شری رام سنٹر میں وبھاشرا کی ہدایت میں پریم چند کے ناول ''غبن'' پر مبنی ڈراما پیش کیا گیا۔

28 اکتوبر کو ''پریم چند بحیثیت اردو ادیب'' کے زیر عنوان منعقدہ اجلاس میں ڈاکٹر قمر رئیس نے ''اردو ادیب کے روپ میں پریم چند'' پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ پریم چند کو مختلف زاویوں سے جاننے اور سمجھنے کی کوشش ضرور ہوتی رہی ہے لیکن ''اصل'' پریم چند کو ہم آج بھی تلاش نہیں کر سکے ہیں۔ سماجی ناانصافی، معاشرے میں پھیلی برائیوں اور مظالم کے خلاف ان کا ردِعمل بے حد شدید تھا۔ وہ حساس تو تھے ہی اس کے ساتھ ان کا مشاہدہ انتہائی غیر معمولی تھا۔ پریم چند فکر و عمل کے ایسے مجاہد کا نام ہے جو رومانی تخیل سے دور حقیقت کی سخت زمین پر کھڑا رہا۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے اپنے مقالے میں کہا کہ پریم چند نے کھیت کھلیان، گائے بیل، مزدور، کسان، ظلم و استحصال، بھوک، غریبی اور معاش کی پیچیدگیوں کو اپنے ناولوں اور افسانوں میں اجاگر کیا ہے۔

جناب مدن گوپال نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اصل پریم چند اردو میں ہی دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے 1924 کے بعد ہندی میں لکھنا شروع کیا۔ پریم چند کا پہلا ناول ''شیاما'' تھا۔ جی کے مانِک ٹالا نے پریم چند کو اردو کا سدابہار تخلیق کار بتاتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اردو اور ہندی فکشن کو طلسماتی داستانوں کی غیر فطری فضاؤں کی بلندیوں سے دھرتی پر اتار کر زندگی کی سنگین سچائیوں سے نہایت ہی فنکارانہ طریقے سے روشناس کرایا ہے۔

''خواتین ڈسکورس اور پریم چند'' کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے ہندی کے ادیب سدھیش پچوری نے پریم چند کو ایک درس گاہ قرار دیا جہاں زندگی کا سبق سیکھا جا سکتا ہے۔ مسز سی پشپا نے پریم چند کو خواتین کے حقوق کا طرفدار بتاتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ہندوستانی معاشرے میں مظالم، استحصال، ناخواندگی اور بے بسی سے چھٹپٹاتی عورت کے کرب و احتجاج کو نہایت ہنرمندی کے ساتھ اپنے افسانوں اور ناولوں میں اجاگر کیا ہے۔ سواس چندر نے بتایا کہ پریم چند ہندوستانی

تہذیب وروایت کے علمبردار اور خواتین کی تعلیم وترقی کے خواہاں تھے۔

مذاکرے کے پانچویں اور چھٹے اجلاس میں بھی پریم چند کی تخلیقات کی مختلف جہتوں پر مختلف دانشوروں نے اظہار خیال کیا۔ اس اجلاس میں شنکر لال پروہت، چندر کانت باندیوڈیکر، کے ایم مالتی، سوما بندوپادھیائے، کرسٹوفر رولینڈ کنگ، ملد ملاداسی لیوااور ڈاگمار مارکوا نے مقالات پیش کیے۔ ان اجلاسوں کی صدارت بال شوری ریڈی اور تھامس ڈی بروجن نے کی۔

پریم چند سیمینار کے تیسرے دن ساتویں اجلاس میں ماہر پریم چند ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا نے انکشاف کیا کہ پریم چند اپنے ناول، افسانہ یا مضمون کا ابتدائی خاکہ انگریزی میں تیار کرتے تھے۔ ان خاکوں کے بعد ہی وہ ہندی یا اردو میں لکھتے تھے۔ ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا نے مزید کہا کہ پریم چند کے اردو سے ہندی کی طرف راغب ہونے کی ایک وجہ مالی ضرورت بھی تھی لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ ہندی کے ذریعے انھیں قومی سطح کا اسٹیج مل رہا تھا۔ ڈاکٹر گوئنکا کے مطابق پریم چند کے تئیں چند اہل اردو کا منفی رویہ بھی اسی حد تک اس کے لیے ذمے دار ہے۔

پریم پال شرما نے کہا کہ پریم چند ایک ایسے اصول پسند ادیب تھے جنھوں نے تمام عمر ایک گوشے میں بیٹھ کر ادب کے ذریعے سماج اور ملک کی خدمت کی۔ اے اروند اکشم نے کہا کہ پریم چند نے اپنے تمام ناولوں میں زندگی کے حقائق کی چھوٹی سے چھوٹی اکائیوں کو ہی خلق کیا ہے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی کے حقائق کی کچھ ایسی صورتیں جن سے باہر کی دنیا کا کوئی مطلب نہیں، ان کے ناولوں کے کینوس کو بامعنی بناتے ہیں۔ اس اجلاس کا موضوع تھا ''پریم چند ناول نگار کے روپ میں۔'' صدارت کمل کشور گوئنکا نے کی۔

آٹھویں اجلاس میں پولینڈ کی دانوتا استاشک نے کہا کہ پولینڈ میں پریم چند کو نہ صرف ہندوستانی ادب کے نمائندے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے بلکہ کلاسکی عالمی ادب کا بھی اہم ترین نمائندہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ پولش زبان میں ان کی چند منتخب کہانیاں ہی دستیاب ہیں جو پریم چند کی پوری تخلیقی دنیا کو پیش نہیں کر پاتیں۔ اٹلی کی فرانسسکا آرینتی نے کہا کہ انھوں نے اپنے ہر ناول میں کوئی نہ کوئی سماجی مسئلہ اٹھایا ہے۔ ان کے ہر کردار کا ذکر ان کے پیشے، ان کے سماجی پس منظر سے شروع ہوتا ہے لیکن ان سب کے باوجود پریم چند کے افسانوی ادب میں میلوڈراما بھرا پڑا ہے۔ اس اجلاس کی صدر ماریہ آفریدی نے گئودان کے حوالے سے پریم چند کے افکار کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ جذباتی نہ ہوں بلکہ دنیا میں پھیلے مظالم، ناانصافی، توہم پرستی اور مفاد پرستی کے خلاف جدوجہد کریں۔ پریم چند کے ادب میں علاقائیت اور عالمیت کے موضوع پر اپنے مقالے میں پریم سنگھ نے کہا کہ ''رنگ بھومی'' میں علاقائیت اور عالمیت کے درمیان کشمکش کو دکھایا گیا ہے۔ لکشمن سنگھ بشد بٹروہی نے کہا کہ پریم چند کو پڑھے بغیر انیسویں اور بیسویں صدی کے بھارت کو نہیں جانا جاسکتا۔

دسویں اجلاس کی صدارت شیو کمار مشرا نے کی جس کا موضوع ''گاندھی واد، تحریک آزادی اور پریم چند'' تھا۔ اس میں وشوناتھ ترپاٹھی، نند کشور آچاریہ، اور رمیش اوپادھیائے نے مقالات پیش کیے۔

مذاکرے کے آخری دن 30 اکتوبر کو ممتاز کمیونسٹ لیڈر بی ٹی رنی دوے کے خیالات پیش کرتے ہوئے بنگلہ ادیب اٹل آچاریہ نے کہا کہ پریم چند سامراجیت، فرقہ واریت اور برادری واد کے زبردست مخالف تھے۔ ملک میں بڑھتی فرقہ پرستی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج سے وہ بے حد تشویش میں مبتلا رہتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ غریبوں کی حمایت کی۔

ہندی ادیب ارون کمل نے کہا کہ گاؤں، قصبوں کے کسانوں، مزدوروں اور نچلے متوسط طبقے کے بارے میں لکھتے ہوئے بھی پریم چند کی تخلیقات سب کے بارے میں ہیں۔ کنور پال سنگھ نے بارھویں اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ پریم چند ایک عظیم تخلیق کار ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تخلیقات کو سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ بھودیو پانڈے نے پریم چند کی نثر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کے مضامین، تبصرے، تنقید، دیباچے، اداریوں اور خطوط وغیرہ کی اہمیت بھی کم نہیں ہیں۔

اس بین الاقوامی سیمینار کا آخری اجلاس مختصر افسانوں کے لیے وقف تھا جس کی صدارت ہندی کے مشہور ومعروف ادیب گری راج کشور نے کی۔ اس میں شیکھر جوشی، چترا مدگل، پریم ود، سارا رائے، ارون پرکاش اور اُدے پرکاش نے اپنے مختصر افسانے پڑھے۔ ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کے سچیدانندن نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی اختتامیہ تقریر میں پریم چند کے ادب، ان کے نظریات وافکار کو وسیع عوامی حلقوں تک پہنچانے پر زور دیا۔ **(ڈاک سے)**

بابا فرید پر دو روزہ ہند و پاک سیمینار

● **چنڈی گڑھ۔ 25 اکتوبر۔** قومی اردو کونسل اور ہریانہ اردو اکادمی کے اشتراک سے 24 اور 25 اکتوبر کو شیخ بابا فرید کی شخصیت، شاعری اور تعلیمات پر دو روزہ ہند و پاک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح عزت مآب ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی، گورنر ہریانہ نے کیا جب کہ جناب پھول چند ملانا (وزیر تعلیم ہریانہ)، جناب کیپٹن اجے سنگھ یادو (وزیر مالیات، ہریانہ) اور محترمہ پروین طلحہ (ممبر پبلک سروس کمیشن) سیمینار کے افتتاحی اجلاس کے مہمان خصوصی تھے۔ سیمینار کے چار اجلاس ہوئے جن میں بابا فرید پر 23 مقالات پیش کیے گئے۔ جن دانشوروں نے اپنے مقالات پیش کیے ان میں پاکستان سے محترمہ شائستہ

نزہت نے "بابا فرید اور مشترکہ تہذیب"، ڈاکٹر راشد متین نے "بابا فرید کی فکری و شعری تعلیمات"، پروفیسر جاوید چانڈیو نے "بابا فرید کی شاعری میں موت، عشق اور زندگی"، ڈاکٹر عبدالمجید شاہد نے "بابا فرید کی شاعری کی بنیاد تصوف" اور پروفیسر سعید احمد نے "بابا فرید اور ان کی شاعری" کے موضوع پر اپنے خیالات پیش کیے۔ ہندوستان کے دانشوروں میں ڈاکٹر ستندر رنور، ڈاکٹر فاطمہ حسن اور ڈاکٹر کملیش موہن نے بھی "بابا فرید کی شاعری اور تعلیمات" پر اپنے مقالات پیش کیے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ریاض پنجابی نے "بابا فرید اور برصغیر میں روحانی اقدار کا احیائے نو"، جناب کشمیری لال ذاکر نے "اُتھہ فرید استیا"، ڈاکٹر دیپک منموہن سنگھ نے "پنجابی پہچان کا سرجن ہار شیخ بابا فرید"، ڈاکٹر جاگیر سنگھ نے "فرید بانی"، ڈاکٹر وسیم راشد نے "بابا فرید کا مسلک اور تعلیمات"، ڈاکٹر رانا گنوری نے "صاحب فضیلت بابا فرید"، جناب غلام نبی خیال نے "کشمیری شاعری اور تصوف"، ڈاکٹر ونیتا نے "کلام فرید کا اسلوب"، ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے "حضرت بابا فریدالدین مسعود کی عظمت اور انفرادیت"، پروفیسر شریف حسین قاسمی نے "حضرت بابا فرید گنج شکر" اور ڈاکٹر فرزانہ نسیم نے "بابا فرید کی سماجی خدمات" پر مقالات پڑھے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر آر۔ بی لانگیان کا مقالہ "صوفی ازم کی انوکھی مثال بابا فرید" اور بال کرشن مضطر کا مقالہ "ہانسی اور بابا فریدالدین گنج شکر" بھی پڑھ کر سنائے گئے۔ اختتامی اجلاس میں پروفیسر ستندر رنور نے سیمینار کی رپورٹ پیش کی جب کہ کشمیری لال ذاکر (سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی) نے مہمانوں کا استقبال کیا اور سفارشات پیش کیں۔

اس سیمینار میں بابا فرید اور ان کے فلسفے سے متعلق کم و بیش نصف درجن کتابوں کی رسم اجرا عمل میں آئی اور بابا فرید کی تعلیمات، ان کی شاعری اور فلسفہ پر تحریر کی گئی کتابوں کی ایک نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اختتام پر سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی جناب کشمیری لال ذاکر نے سبھی شرکا، مہمانوں اور خاص طور پر پاکستان سے آئے دانشوروں کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

اردو پروگرام "گلستان اردو" کا آغاز

● نئی دہلی، 27 اکتوبر۔ "اردو نے بچھڑے دلوں کو جوڑنے کا کام کیا ہے۔ یہ کسی خاص مذہب، خطے یا قوم کی زبان نہیں بلکہ یہ عوام کی زبان ہے۔ اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی (اگنو) اردو کی تعلیم کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔" ان خیالات کا اظہار آج اگنو کی طرف سے دوردرشن کے "گیان بھارتی" چینل پر ایک گھنٹے کے نئے اردو پروگرام "گلستان اردو" کے افتتاح کے موقعے پر جناب خورشید عالم خاں نے کیا۔ اگنو کے سچار ڈپارٹمنٹ میں مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل ارجن سنگھ نے بٹن دبا کر اس نئے پروگرام کا افتتاح کیا۔ براہ راست ٹیلی کاسٹ کیے جا رہے اس پروگرام میں ملک کے مختلف علاقوں سے آنے والی کالوں میں کیے گئے سوالوں کا وزیر موصوف نے موقعے پر ہی جواب دیا۔ جناب ارجن سنگھ نے کہا کہ اگنو تعلیم کے شعبے میں جو کام کر رہی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ اردو کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ اردو اسی ملک میں پیدا ہوئی، پروان چڑھی۔ اردو بھی اسی کھڑی زبان سے پیدا ہوئی جس سے ہندی کا جنم ہوا۔ ان دونوں زبانوں نے مل کر ملک میں گنگا جمنی تہذیب کو جنم دیا جو آج ہمارے ملک کی شناخت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگنو نے اردو کی تعلیم کو فروغ دینے کا جو فیصلہ کیا ہے اس سے لاکھوں لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے سنجیدہ کوششیں جاری ہیں اور اس کے لیے نئے کورس تیار کیے جا رہے ہیں۔ وزیر موصوف نے کہا کہ آج تک کہیں سے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ مدارس میں کوئی ایسی تعلیم دی جا رہی ہو جو ملک کے مفادات کے خلاف ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم مدارس کی جدیدکاری کے لیے اہم پروجیکٹ تیار کر رہے ہیں تاکہ مدارس کی تعلیم کو عصری تقاضوں کے مطابق بنایا جا سکے۔ اردو کا یہ نیا پروگرام دوپہر کو 1.30 بجے سے 2.30 بجے تک دکھایا جائے گا۔ اس پروگرام میں تعلیم، ادب، موسیقی، اطلاعاتی تفریح سے متعلق پروگرام پیش کیے جائیں گے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، محترمہ منورما دیوان، اگنو کے وائس چانسلر ڈاکٹر انس احمد، ڈین جامعہ ہمدرد پروفیسر شاکر جمیل، جے این یو کے پروفیسر نصیر احمد خاں اور عبدالصمد اے ایم بھی موجود تھے جنھوں نے ایک سو سے زیادہ اردو پروگرام تیار کیے ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

فراق گورکھپوری پر مذاکرہ

● پنچکولہ۔ ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے یوم ولادت کے موقعے پر ہریانہ اردو اکادمی کی طرف سے ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس میں جناب انل شرما (آئی اے ایس) کمشنر اعلیٰ تعلیم ہریانہ نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ اس موقع پر جناب رادھے شیام شرما ڈائرکٹر ہریانہ ساہتیہ اکادمی اور جناب ایم ایم شرما ریجنل ڈائرکٹر (آئی سی ایس ایس آر) چنڈی گڑھ نے بھی خصوصی طور پر شرکت کی۔ ابتدا میں جناب کشمیری لال ذاکر، سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی نے پروگرام کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے فراق گورکھپوری سے اپنے ذاتی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ان سے اپنی پہلی ملاقات کے تناظر میں ایک خاکہ "ایک رات کا ہمسفر" پڑھا۔ ان کے بعد محترمہ چھایا تیاگی نے فراق کی ایک غزل پیش کی۔

آر ڈی شرما تاثیر نے اپنے مقالے میں فراق گورکھپوری کی نظم نگاری اور رباعیات اور کیدار ناتھ کیدار نے فراق گورکھپوری کی غزل گوئی پر اپنے خیالات کا

اظہار کیا۔ ڈاکٹر کملیش موہن نے فراق گورکھپوری کے ذہنی رویوں اور ان کی منفی فکر کے موضوع پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر فرزانہ نسیم نے "بات نکلی بات سے گویا وہ تھا میرا بیاں" اور ڈاکٹر محمد ایوب خاں نے "فراق اور ان کا شعری سفر" کے عنوان سے فراق کی حیات اور ان کے کلام پر تفصیل سے اظہار خیال کیا اور ان کے شعری رویوں پر مفصل روشنی ڈالی۔ مقالات کے بعد سیمینار کے مہمان خصوصی جناب اہل شرما نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ فراق ایسے شاعر تھے کہ جن کی ڈگر کو بعد کے بہت سے شاعروں نے اپنایا۔ جلسے کی نظامت مدیر اکادمی جناب شمس تبریزی نے کی۔

(ڈاک سے)

سرسید تقریبات

● میرٹھ، 18 اکتوبر۔ شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور ہائر ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کی طرف سے شعبۂ ماس کمیونی کیشن میں یوم سرسید منایا گیا جس کا افتتاح میرٹھ کالج، میرٹھ کے پرنسپل پروفیسر ایس کے اگروال نے کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ سرسید ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کے نقیب تھے۔ سرسید تقریبات کی صدارت کرتے ہوئے ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر جے کے پنڈیر نے کہا کہ سرسید پورے ملک کے رہنما تھے۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ سرسید کی اصل شناخت ان کا وہ کارنامہ ہے جو ملک وقوم کے لیے آج بھی سرچشمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موقعے پر عاصم علی سبزواری، آفاق احمد خاں، جمال احمد صدیقی، طالب زیدی، قاری شفیق الرحمٰن قاسمی نے بھی سرسید کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر مشتاق صدف اور ڈاکٹر افشاں ملک نے نظامت کے فرائض انجام دیے جبکہ نوازش مہدی اور عفت ذکیہ نے غزلیں پیش کیں۔ اس موقعے پر سرسید احمد خاں کی شخصیت اور خدمات سے متعلق تحریری و تقریری مقابلوں اور کوئز و بیت بازی مقابلوں میں شرکت کرنے والے طلبہ وطالبات کو انعامات سے نوازا گیا۔ آخر میں ڈاکٹر کہکشاں لطیف نے شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

شان الحق حقی کی یاد میں جلسہ

● علی گڑھ، 21 اکتوبر۔ اردو کے مشہور شاعر، مترجم، زبان داں اور دانشور، شان الحق حقی کے سانحۂ ارتحال پر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت پروفیسر اسلوب احمد انصاری منعقد ہوا جس میں پروفیسر شہریار، پروفیسر سعید الظفر چغتائی اور یونیورسٹی کے دیگر شعبوں کے اساتذہ اور طلبہ نے شرکت کی۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر قاضی افضال حسین نے حقی صاحب کے علمی اکتسابات، ادبی خدمات اور شخصیت کے اہم پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ شان الحق حقی نے ادبی اظہار کے کئی وسیلوں اور پیرایوں کو بیک وقت استعمال کیا۔ کوٹلیہ کے ارتھ شاستر کا انھوں نے ایسا عمدہ ترجمہ کیا جو اپنے اصل متن سے قریب ہوتے ہوئے زبان وبیان کی دلکشی بھی رکھتا ہے۔ ان کی شاعری نئے نئے تجربات سے عبارت ہے۔ "تار پیراہن"، "حرف دل رس"، "دل کی زبان" ان کے شعری مجموعے ہیں۔ پہیلیوں، کہہ مکرنیوں اور بچوں کی نظموں کے بھی انھوں نے مجموعے شائع کیے۔ عالمی ادب کی 125 منتخب نظموں کا ترجمہ انھوں نے "درپن درپن" کے نام سے کیا۔ قاضی نذرالاسلام کی نظموں کا ترجمہ "صور اسرافیل" کے نام سے اور شیکسپیئر کے ڈرامے "انٹونی کلیوپیٹرا" کا ترجمہ "قہر عشق" کے نام سے کیا۔ انھوں نے بھگوت گیتا کا بھی ترجمہ کیا۔ "نکتۂ راز"، "نقد ونگارش" اور "میزان" ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔ ان کی دیگر اہم تصانیف میں "شاخسانے"، "لسانی مسائل و لطائف" اور "نگارخانہ" مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری کی ترتیب بھی ان کا ایک بڑا کام ہے۔ انھوں نے ایسے دور میں جب زبان وبیان کی صحت کا خیال عام طور پر نہیں رکھا جاتا، فرہنگ تلفظ مرتب کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ڈپٹی نذیر احمد سے خاندانی نسبت کے سبب دلی کی ٹکسالی زبان اور محاوروں پر انھیں قدرت کاملہ حاصل تھی۔ حقی صاحب بے حد نرم مزاج، خوش اخلاق اور مہمان نواز انسان تھے۔ تہذیب و شائستگی ان کی فطرت میں رچی بسی ہوئی تھی۔

اردو اور انگریزی کے مشہور نقاد پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے حقی صاحب کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ حقی صاحب نے شیکسپیئر کے ڈرامے انٹونی کلوپیٹرا کا جو مثنوی کی ہیئت میں منظوم اردو ترجمہ کیا اس کے سلسلے میں میری رائے کوئی بہت اچھی نہیں تھی لیکن وہ کشادہ دل اتنے تھے کہ انھوں نے اس کا کبھی برا نہ مانا۔ شائستگی اور نفاست ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ مولوی عبدالحق کے بعد اعلیٰ درجے کی نثر لکھنے والوں میں حقی صاحب کا نام بے حد اہم ہے۔ آخر میں شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب نے تعزیتی قرارداد پیش کی۔

(ڈاک سے)

یوم اردو کا انعقاد

● نئی دہلی، 10 نومبر۔ جدوجہد آزادی کے دوران "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" جیسا ترانہ لکھ کر پورے ملک میں بھائی چارے اور قومی جذبے کی تبلیغ کرنے والے شاعر علامہ اقبال کے یوم ولادت کو پورے ملک میں یوم اردو کے طور پر منایا گیا۔ اس موقعے پر مقررین نے کہا کہ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی، پلی، بڑھی اور پروان چڑھی، اسے کسی مذہب کے ساتھ جوڑنا اردو کے

ساتھ ساتھ ملک کی متنوع تہذیب وثقافت کے ساتھ بھی ناانصافی ہے۔

ذاکر حسین میموریل سینئر سیکنڈری اسکول جعفرآباد، دہلی میں منعقد یوم اردو تقریب کے کنوینر ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ حکومت کے ساتھ اردو سے وابستہ تنظیموں کو بھی آگے آکر اردو کی ترقی کا عملی طریقہ کار تلاش کرنا ہوگا اور اس پر عمل کرنا ہوگا۔ صدر جلسہ پروفیسر محمد اقبال سابق وائس چانسلر جامعہ ہمدرد نے کہا کہ اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے انفرادی اور الگ الگ تنظیموں کی بجائے مشترکہ پلیٹ فارم سے قانونی لڑائی لڑنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین چودھری محمد متین نے کہا کہ دہلی میں اردو صرف کاغذوں پر ہی دوسری سرکاری زبان ہے، عملی طور پر اردو کا استعمال کہیں نظر نہیں آتا۔ جلسے میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ دہلی، اتر پردیش، بہار اور آندھرا پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے لیکن ریاستی حکومتیں اردو میں کام کاج کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھا رہی ہیں۔ (ڈاک سے)

اعزازات و انعامات

مخمور سعیدی کو فراق سمان

● گورکھپور، 23 اکتوبر۔ "مخمور سعیدی نے فراق گورکھپوری کی شعری روایت کو نہ صرف آگے بڑھایا ہے بلکہ اس روایت کو تقویت بھی بخشی ہے۔ مخمور سعیدی کو فراق سمان برائے 2005 عطا کر کے خود یووا چیتنا سمیتی، گورکھپور نے اپنے اعزاز میں اضافہ کیا ہے۔" ان خیالات کا اظہار سینئر ادیب اور شمال مشرقی ریلوے کے اعلی افسر رن وجے سنگھ نے دین دیال اپادھیائے گورکھپور یونیورسٹی میں یووا چیتنا سمیتی کی طرف سے منعقدہ آٹھویں فراق سمان تقریب میں بطور مہمان خصوصی کیا۔ اس تقریب کے مہمان اعزازی محمد اعظم خاں نے کہا کہ ہندی اور اردو ایک دوسرے کے بغیر ادھوری ہیں۔ یہ دونوں زبانیں نہ صرف گفتگو کا ذریعہ ہیں بلکہ دلوں کو جوڑنے کا بھی کام کرتی ہیں۔ ڈاکٹر عزیز احمد نے کہا کہ مخمور سعیدی نے اردو شعر و ادب کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مخمور صاحب کے دس شعری مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ گفتنی، سیہ بر سفید، آواز کا جسم، سب رنگ، واحد متکلم، آتے جاتے لمحوں کی صدا، بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا، دیوار و در کے درمیاں، عمر گزشتہ کا حساب، راستا اور میں۔ دیوناگری میں پیڑ گرتا ہوا اور گھر کہیں گم ہو گیا شائع ہوئے ہیں۔ تنقیدی مضامین کے دو مجموعے بازدید اور میرے عہد کی صدائیں اور داغ کی سوانح "داغ دہلوی" کے علاوہ انھوں نے کئی تراجم بھی کیے ہیں جس میں سے دو خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ایک تو مرزا غالب کی فارسی کتاب "دستنبو" اور دوسرا کرشنا سوبتی کا ہندی ناولٹ "مترو مرجانی"۔ ان کی شخصیت اور شاعری پر شین کاف نظام نے "بھیڑ میں اکیلا" اور اطہر فاروقی نے "مخمور سعیدی ایک مطالعہ" کے نام سے کتابیں مرتب کی ہیں۔ بھوپال یونیورسٹی میں ان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی لکھا گیا ہے۔ یووا چیتنا سمیتی کے صدر راندھا تا سنگھ نے تنظیم کی کارکردگیوں پر روشنی ڈالی۔

اس موقعے پر جناب مخمور سعیدی نے کہا کہ فراق کو یاد رکھنا ایک روایت کو یاد رکھنے کے مترادف ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور ہندی کی بنیاد ایک ہی ہے اس لیے دونوں زبانوں کو قریب لانے کی ضرورت ہے۔ فراق گورکھپوری نے عام انسان کی زندگی کو اپنی غزلوں میں سمو دیا جس کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں ان کا مقام منفرد ہے۔ تقریر کے بعد جناب مخمور سعیدی نے اپنی چند غزلیں اور نظمیں بھی پیش کیں۔ صدر جلسہ سینئر ادیب اور ہندی رسالے "آلوچنا" کے ایڈیٹر پروفیسر پرمانند شریواستو نے کہا کہ فراق سمان سے سرفراز ادبی شخصیات میں مخمور سعیدی کا انتخاب سب سے عمدہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ مخمور سعیدی کی شاعری میں تفکر اور وسیع عالمی زندگی کی عکاسی موجود ہے۔ تقریب کے کنوینر ڈاکٹر انیل شریواستو نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے بتایا کہ فراق سمان اب تک مہیش اشک، راجیش شرما، ظفر گورکھپوری، ڈاکٹر وجے چترویدی، شہریار، آلوک دھنوا اور کیفی اعظمی کو دیا جا چکا ہے۔

اس موقعے پر سامعین کی کثیر تعداد موجود تھی جس میں خاص طور سے ڈاکٹر وِمل مودی، ڈاکٹر دھرم ودت تیواری، ڈاکٹر رام دیو شکل، ڈاکٹر انیل رائے، مشتاق علی، ڈاکٹر افغان اللہ خاں اور کہکشاں بانو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ (ڈاک سے)

اسلوب احمد انصاری کو مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ

● علی گڑھ، 14 ستمبر۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے سابق سربراہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری کو اس سال اردو ادبی تنقید کے میدان میں ان کی گراں قدر خدمات پر یوپی اردو اکادمی نے مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ دیا ہے۔ انگریزی زبان کے اسکالر پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی شیکسپیئر اور اٹھارھویں صدی کے برطانوی شاعر ولیم بلیک کی تخلیقات پر نہایت مضبوط گرفت ہے۔ ولیم بلیک پر ان کی تصنیف کو دنیا بھر میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کتاب کو برطانیہ، امریکہ اور کناڈا نے 2001 میں ایک ساتھ شائع کیا تھا۔

پروفیسر انصاری کو اس سے قبل ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور حکومت پاکستان کے اعزاز سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ انھوں نے آدھا درجن سے بھی زائد کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں غالب، اقبال اور رشید احمد صدیقی پر بھی کتابیں شامل ہیں۔ انھوں نے اردو کی ادبی شخصیات کے خاکوں کا مجموعہ بھی تصنیف کیا ہے۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

مختصرات

● ناگپور۔ طلبہ اور نوجوانوں کی تنظیم یونائیٹیڈ اسٹوڈینٹس ایسوسی ایشن، مومن پورہ، ناگپور کی طرف سے علامہ اقبال کے یوم پیدائش کے موقعے پر ریاستی سطح پر مضمون نویسی کا مقابلہ ہوا جس کا موضوع ہائی اسکول گروپ کے لیے ''ٹیلی ویژن کے اخلاق پر اثرات'' اور جونیئر کالج گروپ کے لیے'' کیا عالمی دہشت گردی کے لیے مسلمان ذمے دار ہیں؟'' تھا۔ مہاراشٹر کے 163 اسکولوں اور کالجوں کے کل 1053 طلبہ وطالبات نے اس مقابلے میں حصہ لیا جس میں ہائی اسکول گروپ سے فرحانہ انصاری اشتیاق احمد کو اوّل، صفیہ شیخ غلام دستگیر کو دوم اور ریحان احمد عبدالرحمن کو سوم انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔ جونیئر کالج گروپ سے محمد طاہر مولوی یعقوب کو اول، حسینہ بانو بنت حافظ علاء الدین کو دوم اور صادق خاں رحمت اللہ خاں کو سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ مضمون نویسی کے مقابلے میں شریک تمام طلبہ وطالبات کو سند سے نوازا گیا۔ (ڈاک سے)

● اڈاتور (مہاراشٹر) 15 اکتوبر۔ شعبۂ انگریزی، مہاراشٹر، اودے گیری کالج، اودگیر کی طرف سے ایم اے (انگلش) سالِ دوم کے طلبہ کے لیے ڈاکٹر مقبول احمد مقبول لیکچرر شعبۂ اردو نے ایک توسیعی خطبہ بعنوان ''عمر خیام کی رباعیات'' پیش کیا جس کی صدارت پروفیسر ایس ایم بوکل سابق صدر شعبۂ انگریزی نے کی۔ ڈاکٹر مقبول نے عمر خیام کی شخصیت، فن اور اس کے فلسفۂ حیات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ وہ مختلف علوم وفنون مثلاً شاعری ریاضی، طبیعیات، نجوم، فلکیات اور یونانی طب کا ماہر تھا۔ عمر خیام کی رباعیات کے تراجم دنیا کی کئی ترقی یافتہ ادبی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ خیام کی قدر ومنزلت ایشیا سے زیادہ یورپ میں ہوئی۔ قبل ازیں پروفیسر مرڈگے نے ڈاکٹر مقبول کا تعارف پیش کیا۔ آخر میں طالب علم ودیک بورلکر کے شکریے پر جلسے کا اختتام ہوا۔

(ڈاک سے)

شعر و افسانہ کی محفلیں

● ناگپور، 15 اکتوبر۔ افسانہ نگار زندگی کی سچائیوں کو بے نقاب کرکے ہمیں احساس اور بصیرت عطا کرتا ہے تاکہ ہم زندگی کو بہتر طور پر سمجھ سکیں اور برت سکیں۔ ہمارے طلبہ میں موجود افسانہ نگاری کی صلاحیت کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی ضروری ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی لازمی ہے کہ وہ نمائندہ افسانہ نگاروں کا مطالعہ کریں۔ ان خیالات کا اظہار صدر جلسہ معروف انشائیہ نگار اور مراٹھی کے مترجم ڈاکٹر محمد اسداللہ نے ایل اے ڈی کالج، ناگپور شعبۂ اردو اور فارسی کی جانب سے منعقدہ بزم افسانہ میں کیا۔ کالج کی نائب پرنسپل دیشمکھ نے بھی اس موقعے پر اپنے خیالات پیش کیے۔

ابتدا میں پروفیسر شبانہ نے مہمان کا تعارف پیش کرتے ہوئے کالج کی ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ اور افسانہ خوانی کی اہمیت بیان کی۔ اس محفل میں سینئر کالج کی طالبات طاہرہ خورشید، بشریٰ فردوس اور ریشماں انجم نے اپنے افسانے سنائے۔ افسانہ نگار ڈاکٹر قمر جہاں (صدر شعبۂ فارسی، ایل اے ڈی کالج)، نے اپنا افسانہ ''دھوپ چھاؤں'' پیش کیا۔ صدر شعبۂ مراٹھی ڈاکٹر سنند ادیش پانڈے اور ڈاکٹر سندھیا گاڈگے، صدر شعبۂ سنسکرت نے اپنے مراٹھی افسانوں کے تراجم پیش کیے۔ اس بزم میں پیش کیے گئے افسانوں کا تجزیہ بھی کیا گیا۔ جلسے کی نظامت پروفیسر شکیلہ بانو نے کی اور رسم شکریہ ڈاکٹر قمر جہاں نے ادا کی۔

(ڈاک سے)

● ڈھاکہ 23 ستمبر۔ قصاب ٹولہ، زنانہ مدرسہ میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت محمد تخی میاں صدر ڈھاکہ اردو اکادمی نے کی۔ ان کی مادری زبان بنگلہ ہے مگر اردو سے انھیں بڑی محبت ہے۔ انھوں نے لڑکیوں کا ایک مدرسہ قائم کیا ہے جس کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ مشاعرے کے ناظم ارمان شمس تھے۔ انھوں نے صدارتی تقریر میں کہا کہ آپ حضرات اپنی زبان اردو بولیے اور پڑھیے اور لکھیے۔ مایوسی کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمت سے کام لیجیے۔ جگہ جگہ ماہانہ مشاعرے کا اہتمام کیجیے تاکہ اردو عام ہو۔

مشاعرے میں محمد شمیم، قمر شمسی، جمیل اختر، ارمان شمسی، جلال عظیم آبادی، صابر علی صابر، صغیر احمد اصغر اور نور خاں نور نے اپنا کلام پیش کیا۔ اس موقعے پر ارتضیٰ الرحمٰن خاں، خواجہ محمد کامل، محمد ابوالقاسم، محمد محی الدین، آفتاب عالم، محمد نسیم احمد، رفیق الاسلام، شعیب عظیم وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ (ڈاک سے)

● چنئی، 10 ستمبر۔ تملناڈو گورنمنٹ اردو اکادمی اور نیشنل چیمبر آف کامرس کے باہمی اشتراک سے ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت نواب محمد عبدالعلی، وائس چیئرمین، تملناڈو گورنمنٹ اردو اکادمی نے کی۔ عزت مآب این رام، مدیر اعلیٰ، ''دی ہندو'' نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے مشاعرے کا افتتاح کیا۔ مہمان شعرا میں ندا فاضلی اور راحت اندوری کے علاوہ جناب حق کانپوری، جوہر کانپوری، نفیس کانپوری، جناب نعیم اختر، نظام بخاری، جناب بیدم حیدرآبادی، ڈاکٹر نزہت انجم، محترمہ شبینہ ادیب، محترمہ ممتاز نسیم دہلوی، جناب مختار بدری، جناب عتیق جاذب، ڈاکٹر سید سجاد حسین، جناب کے ملک العزیز،

جناب اشفاق الرحمٰن مظہر اور جناب شاداب بے دھڑک نے شرکت کی۔ مشاعرے کی نظامت مشترکہ طور پر ڈاکٹر اعجاز کمال اور جناب نعیم اختر نے کی۔ (ڈاک سے)

[illegible]

کلام اعزاز افضل

● بنگال، 29 جولائی۔ مشہور شاعر اعزاز افضل کے کلیات کے اجرا کے موقعے پر ممتاز اردو شاعر مظہر امام نے کہا کہ اعزاز افضل نے اپنی ترقی پسند فکر کے اظہار کو کبھی بے لگام نہیں ہونے دیا، اپنی آواز میں انفرادیت رکھی اور لفظوں کو برتنے کے عمل میں اپنی الگ شناخت بنائی۔ پروفیسر مظفر حنفی نے کہا کہ اعزاز افضل کی شاعری علامہ رضا علی وحشت اور پرویز شاہدی کے عہد سے آگے کی شاعری ہے۔ بلند خیال کو بھی نرم و گداز انداز میں پیش کرنے کا جو فن ان کے یہاں ہے وہ دوسروں کے یہاں تقریباً مفقود ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ''کلام اعزاز افضل'' میں شاعر کی جن غزلوں کا احاطہ نہیں کیا جاسکا ہے انھیں یکجا کرکے جلد سامنے لایا جائے۔ اس موقعے پر عبدالسلام عاصم، ڈاکٹر شکیل اختر، سید عبدالباری اور ڈاکٹر خالد محمود نے بھی اظہار خیال کیا۔ (ڈاک سے)

شارب ردولوی: شخصیت اور تنقید نگاری

● حیدرآباد، 29 ستمبر۔ ڈاکٹر عرشیہ جبیں لکچرر شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد کی کتاب ''شارب ردولوی: شخصیت اور تنقید نگاری'' کا اجرا ممتاز محقق و نقاد پروفیسر مغنی تبسم نے کیا۔ 416 صفحات پر مشتمل یہ کتاب ڈاکٹر عرشیہ جبیں کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ اجرا کی رسم حیدرآباد یونیورسٹی میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور پر منعقدہ سہ روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں انجام پذیر ہوئی۔ اجلاس میں پروفیسر سدھاکر مراٹھے ڈین اسکول آف ہیومنیٹیز صدر اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی بحیثیت مہمان خصوصی موجود تھے۔ دیگر شرکا میں پروفیسر وہاب قیصر، پروفیسر محمد انورالدین، جناب ضیاء الدین شکیب (لندن) پروفیسر سید سجاد حسین (چنئی) پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر حمید سہروردی، اور دیگر متعدد اہم شخصیات شامل تھیں۔ کتاب کی قیمت تین سو روپئے ہے جو مصنفہ سے شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ (ڈاک سے)

گل دیگر شگفت

● کڈپہ۔ نئے لہجے کے شاعر و ادیب عقیل جامد کے شعری مجموعے ''گل دیگر شگفت'' کا اجرا ڈاکٹر اسماعیل پاپانی میموریل لائبریری، میلاد گھر، کڈپہ میں الحاج محمد احمد اللہ رکن اسمبلی، حکومت آندھرا پردیش نے کیا۔ اس موقعے پر عقیل جامد کے فن اور شخصیت پر علیم صبا نویدی، ڈاکٹر راہی فدائی، ساغر حیدری اور یوسف صفی نے مقالے پیش کیے۔ بعد ازاں ایک غیر طرحی مشاعرہ ستار فیضی کی نظامت میں منعقد ہوا جس میں ساغر جیدی، علیم صبا نویدی، یوسف صفی، شکیل احمد، ساقی، ستار فیضی اور عقیل جامد نے کلام پیش کیا۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

امرتا پریتم

● نئی دہلی، 31 اکتوبر۔ پنجابی زبان کی ممتاز شاعرہ اور فکشن نگار امرتا پریتم کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ 86 برس کی تھیں۔ پسماندگان میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ خاوند کا پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے۔ گیان پیٹھ اور متعدد عظیم ایوارڈ یافتہ امرتا پریتم نے 31 اکتوبر کی سہ پہر کوئی تین بجے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اگرچہ ان کی صحت اچھی نہیں تھی لیکن کوئی تکلیف وہ عارضہ لاحق نہیں تھا۔ دونوں زبانوں میں تقریباً 200 کتابوں کی مصنفہ امرتا پریتم اپنی سرگرم زندگی میں ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں ہمیشہ پیش پیش رہیں۔ ادب میں سرزمین پنجاب سے اولین خاتون کی شناخت کے ساتھ ابھرنے والی اس ادیبہ نے تقسیم ہند کے بعد دہلی کو وطن ثانی بنا لیا تھا۔ وہ پہلی خاتون تھیں جنھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ 1969 میں صدر جمہوریہ ہند نے انھیں پدم شری کے خطاب سے نوازا۔ فرانسیسی، جاپانی اور ڈینش کے علاوہ مشرقی یورپ کی تمام زبانوں میں ان کی تخلیقات کا ترجمہ کیا گیا۔ انھوں نے دہلی، جبل پور اور وشوا بھارتی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ آخر دم تک وہ پنجابی رسالہ ''ناگ منی'' کی ادارت کرتی رہیں۔ ممتاز ترقی پسند شاعر ساحر لدھیانوی سے ان کی گہری دوستی تھی۔ ساحر ان کے پسندیدہ شاعر تھے اور ان سے ان کی خاص رغبت تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اور دیگر علمی و ادبی اداروں نے امرتا پریتم کے انتقال کو دونوں زبانوں کے ادب کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔

□□□

تبصرہ وتعارف

اتحاد سے انتشار کی طرف — کلونیل اودھ کے قصبات

مصنف: مشیر الحسن، مترجم: مسعود الحق
صفحات: 415، قیمت: -/216 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066
مبصر: محمود سعیدی

پروفیسر مشیر الحسن ہمارے عہد کے ممتاز مورخین میں ہیں لیکن تاریخ کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر عام مورخین سے قدرے نہیں خاصا مختلف ہے۔ وہ تاریخ کو خلا میں رونما ہونے والے بے روح واقعات کی کھتونی نہیں بلکہ مختلف ادوار میں زمین پر چلتی پھرتی متحرک زندگی کا بیان سمجھتے ہیں جس میں صرف عمائدین نہیں بلکہ عام انسان بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کتاب سے پہلے قومی اردو کونسل نے ان کی ایک اور کتاب ''جان کمپنی سے جمہوریہ تک: جدید ہندوستان کی کہانی'' شائع کی تھی جس میں انھوں نے ہماری جدوجہد آزادی کی تاریخ اپنے اسی مخصوص انداز میں بیان کی ہے۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ تمام واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہورہے ہیں اور یہ کہ ہم محض ان کے ناظر نہیں، کہیں نہ کہیں ان میں شریک بھی ہیں۔

زیر نظر کتاب میں مشیر الحسن صاحب نے اودھ کی قصباتی زندگی کو مرکز میں رکھ کر آزادی سے قبل اور بعد کے ان واقعات وسانحات کی کھوج کی ہے جن کے پیچھے گوناگوں سیاسی، سماجی اور ساتھ ہی شخصی عوامل کارفرما تھے۔ قصبہ، جو شہر اور گانو کی درمیانی کڑی تھا اور شہر کی بے جا امارت پسندی اور گانو کی حد سے بڑھی ہوئی فلاکت اور پس ماندگی کے درمیان ایک حدِ اعتدال قائم کرتا تھا اور ایسی شخصیتیں پیدا کرتا تھا جو ان دو انتہاؤں میں توازن پیدا کرتی تھیں۔ آزادی کے بعد شہروں کی توسیع کے عمل نے دھیرے دھیرے قصبات کو اپنی پھیلتی بڑھتی ہوئی حدوں میں کس طرح شامل کرلیا اور وہ ثقافتی فضا جس کی پرورش قصباتی ماحول میں ہوئی تھی اور جو مذہبی اور لسانی عصبیت سے یکسر پاک تھی، کس طرح ناپید ہوتی گئی اور اس کی جگہ ایسے تعصبات لینے لگے جن کی موجودگی کا ماضی میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ یہ ساری تفصیلات اور ان کے ذیل میں آنے والی توضیحات کو مشیر الحسن نے بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔

کتاب میں خصوصی حوالہ قدوائی خاندان کا ہے جس نے کئی اہم شخصیتیں پیدا کیں۔ ماضی قریب میں ولایت علی بمبوق جو رفیع احمد قدوائی کے چچا اور حسرت موہانی کے معتقد تھے، بیگم انیس قدوائی جن کے شوہر عین عالم جوانی میں فرقہ وارانہ تعصب کا ہدف بنے لیکن جنھوں نے گاندھی جی کے ایما پر پاکستان سے اجڑ کر آنے والے پناہ گزینوں کی بازآبادکاری میں تندہی سے حصہ لیا، ان کے دیور اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر خوراک رفیع احمد قدوائی جن کی نجی زندگی درویشانہ تھی، شفیق الرحمٰن قدوائی جنھوں نے اپنے بڑوں کی خواہش کے برعکس اپنا ذاتی کیریئر بنانے کی بجائے قومی خدمات کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ اور دوسرے بہت سے کردار جنھوں نے اپنے دور کی حیات اجتماعی کو مثبت انداز میں متاثر کیا، ان سب سے اس کتاب میں آپ کی ملاقات ہوگی۔

پروفیسر مشیر الحسن کا خیال ہے کہ قصباتی زندگی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی جداگانہ شناخت میں کٹرپن نہیں تھا، ایک ملی جلی ثقافت تھی جو شہری ثقافت پر بھی اثر انداز ہوتی تھی اور خیر سگالی کا ماحول پیدا کرتی تھی۔

قصباتی پس منظر اور خاندانی تاریخ کی مدد سے مشیر الحسن صاحب انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں کے نصف اول میں سامنے آنے والے دوررس تاریخی عوامل کو جس خوبی سے حیطۂ تحریر میں لائے ہیں، وہ داد طلب ہے۔ اس کام کو ان جیسا کوئی شخص ہی سرانجام دے سکتا تھا جو تاریخ کو صرف سیاست نہیں، تہذیب وثقافت، شعر وادب اور دیگر فنون لطیفہ کی مدد سے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مشیر الحسن صاحب نے کتاب کے کم وبیش تمام ابواب کا آغاز کسی شعر، کسی نظم یا افسانوی تحریر کے اقتباس سے کیا ہے۔

پہلا باب غالب کے اس مشہور شعر سے شروع ہوا ہے:

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے
(ص-54)

اس میں غلطی سے مصرع ثانی کے آخری لفظ 'ہے' کو 'ہو' سے بدل دیا گیا ہے

باب پنجم کے شروع میں ناصر کاظمی کا مصرعہ جلی حروف میں درج ہے:

اک نیا گھر بنائیں گے — صبر کر صبر کر
(ص-27)

جو ناموزوں ہے درمیان میں ایک لفظ چھوٹ گیا ہے جو غالباً ''ہم'' ہے۔

باب ہفتم کے آغاز میں اختر الایمان کا ایک مصرعہ اس طرح درج ہے:

دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس جہان خراب میں

یہ مصرعہ بھی موزوں نہیں ہے اور اصل مصرعے سے مختلف بھی ہے۔ مصرع یوں ہے:

دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

مسعود الحق صاحب مشاق مترجم ہیں لیکن اس کتاب کے ترجمے میں اس سلاست کی کمی ہے جو ان کے ترجموں کا خاصہ ہے۔ کہیں کہیں عبارت میں الجھاؤ بھی ہے۔ ایک جملہ ہے "اس کتاب کو منظر عام پر آنے میں پچیس طویل برس لگ گئے" (ص 56) اس کی بہتر شکل یہ ہوتی "اس کتاب کو منظر عام پر آنے میں پچیس برس کا طویل عرصہ لگ گیا" ایک اور جملہ ہے "ایک سو تیس ہزار مسلمانوں نے جام شہادت پیا" (ص 95) "ایک سو تیس ہزار" کی جگہ "ایک لاکھ تیس ہزار" لکھنے میں کیا مضائقہ تھا" قاضی قدوہ کی تفوق والی نسل کے اخلاف 'سرکار' کہلائے گئے" (ص-99) "کہلائے گئے" کی جگہ صرف "کہلائے" کافی تھا۔ صفحہ 89 پر "بے شمار آرائیں" بھی محل نظر ہے۔ 'آرا' خود رائے، کی جمع ہے جمع الجمع بنانے کی کیا ضرورت تھی۔

بعض جملے زیادہ طویل ہو گئے ہیں، انھیں دو یا تین ٹکڑوں میں بانٹا جا سکتا تھا۔ بہر کیف مترجم نے اس ضخیم اور مطالب کے لحاظ سے بعض مقامات پر کچھ ادق کتاب کو انگریزی سے اردو میں منتقل کرنے میں جو محنت صرف کی ہے اس کی داد دی جانی چاہیے۔

●

ناٹک ساگر/ نورالٰہی و محمد عمر

صفحات: 456، قیمت: -/163 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: فیاض عالم

ڈراما نگاری اور اس کی تاریخ پر اردو میں لکھی گئی اولین کتابوں میں "ناٹک ساگر" کا شمار ہوتا ہے۔ پندرہ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں دنیا کے مختلف حصوں میں ڈرامے کی روایت اور اس کی اقسام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "ناٹک ساگر" میں ڈرامے کی عہد بہ عہد ترقی، اس کا عروج، ارتقا اور تنزل، فن تمثیل (اداکاری، اسٹیج کا لباس اور سینری وغیرہ) سے بخوبی واقف کرایا گیا ہے۔

ابتدا میں پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی نے اپنے مبسوط مقدمے میں نہ صرف کتاب کا جامع تعارف پیش کیا ہے بلکہ موضوع سے متعلق چند ایسے امور پر بھی روشنی ڈالی ہے جن سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ انھوں نے مشہور رزمیہ تخلیق "الیڈ" کو ایشیائی تخلیق قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"تاریخ بتاتی ہے کہ 1000،800 ق م کے درمیان ایک ایشیائی شاعر، جو سمرنا میں رہتا تھا، اس نے سب سے اوّل یہ کتاب تصنیف کی۔ اس کے دو صدی بعد یونان کے ایک بھاٹ ہومر نے اسے اپنی زبان میں بعد کی دیشی ترجمہ کیا۔ الیڈ میں کئی مقامات پر اہل ہنود کی مذہبی کتاب وید سے استفادے کا ثبوت ملتا ہے۔"
(ناٹک ساگر، ص-17)

اپنی بات کے ثبوت میں کیفی صاحب نے ایچ آر جے ٹلیارڈ کی تواریخ یونانی لٹریچر اور میکس مولر کی کتاب ہسٹری اور سنسکرت لٹریچر کے حوالے بھی پیش کیے ہیں۔

سنسکرت ناٹکوں پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے بتایا ہے کہ قدیم ہندی اسٹیج پر زنانہ کردار ہمیشہ عورتیں ادا کرتی تھیں جبکہ قدیم یونانی اسٹیج پر یہ کردار مرد ادا کرتے تھے۔ بھوبھوتی کی اوتر رام چرتر میں اسٹیج کے اندر اسٹیج دکھایا جاتا تھا جس کی مثال یونانی اسٹیج میں نہیں ملتی۔ ودھوشک بھی صرف اور صرف سنسکرت ناٹک کا حصہ ہے۔ یہ کسی اور زبان میں موجود نہیں۔

اردو اسٹیج پر گفتگو کے ضمن میں کیفی نے طالب بنارسی، احسن، آغا حشر اور بیتاب کے ڈراموں کی خصوصیات پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ ان ڈراما نگاروں سے بھی واقف کرایا ہے جو اس فن میں زیادہ شہرت نہیں رکھتے مثلاً عبدالحلیم شرر، شوق لکھنوی، جوالا پرشاد برق، عبدالماجد دریابادی، دوارکا پرشاد افق وغیرہ۔

کتاب کے پہلے باب میں یونانی ڈرامے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں ڈرامے کی تعریف، ٹریجڈی (المیہ) اور کامیڈی (طربیہ) کی خصوصیات اور اقسام اور یونان میں ڈراما نگاری کے آغاز اور ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنفین نے تھس پس کو فن ڈراما کا موجد اور ایسکائلس کو المیے کا بابا آدم قرار دیا ہے۔ یونان میں ڈرامے کے عہد بہ عہد ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے سوفوکلیز یوریپیڈیز، ازاکیل، کریٹینس، یوپولس، کریٹس، ارسٹوفینز کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔

باب دوم میں روم اور اٹلی میں ڈراما نگاری کی روایت پر نظر ڈالتے ہوئے بیلٹ، اریسٹو، تاسو، گولڈونی، کونٹ کارلوگوزی، ماتاس ٹیسو، کونٹ الفوری، گبرائیل ڈی انین زیو، گاؤ کنڈا وغیرہ کی ڈراما نگاری سے روشناس کرایا گیا ہے۔

تیسرا باب اسپین میں ڈراما نگاری کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں ہسپانوی ڈرامے کے بانی لوپ فلکس ڈی ویگا کارپیو (1635-1562) کے علاوہ میگل ڈی سوڈراسروانٹیر، کالڈرون وغیرہ ڈراما نگاروں سے واقف کرایا گیا ہے اور چوتھے باب میں پرتگال میں ڈرامے کی روایت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

پانچویں باب میں بتایا گیا ہے کہ فرانس میں فن ڈراما کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور کئی فرانسیسی ڈراما نگاروں کو عالمی سطح پر شہرت حاصل ہوئی۔ فرانس میں گیارھویں صدی عیسوی میں ڈرامے کا آغاز ہوا۔ فرانس کے ڈراما نگاروں میں پیری کارنیل، ریسائن، مولیئر (1673-1622)، فرانس ہری اروث ڈی والٹیئر (1778-1694)، ڈڈراٹ (1784-1713) الکزینڈر ڈوماسینئر اور

جونیئر، وکٹر ہیوگو (1802-1885) سارا برنارڈ نے بے حد شہرت حاصل کی۔

چھٹا باب تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر محیط ہے جس میں انگلستان میں ڈرامے کے ارتقائی سفر کا نو ذیلی ابواب میں تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ انگلستان میں ابتدائی عہد میں مذہبی اور اخلاقی ڈرامے دکھائے جاتے تھے۔ لارڈ ٹامس سیک وائل نے سولھویں صدی میں پہلا المیہ ڈراما ''کاربوڈوک'' کے نام سے لکھا۔ بعد کے ڈراما نگاروں میں جارج گسکائن، جان لالی، جارج پیل، رابرٹ گرین، کرسٹوفر مارلو وغیرہ اہم ہیں۔ اس کے بعد شیکسپیئر جیسا شہرۂ آفاق ڈراما نگار (1564-1616) سامنے آیا جس نے انگریزی ڈرامے کو نئی بلندی عطا کی۔ اس کے ڈراموں میں رومیو جولیٹ، مرچنٹ آف وینس، اے مڈسمر نائٹس ڈریم، جولیس سیزر، ہیملٹ، آتھیلو، انتونی اینڈ کلیوپیٹرا وغیرہ کو عالمی پیمانے پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ شیکسپیئر کے بعد کے ڈراما نگاروں میں ٹامس وڈ، جارج چیپ مین، جین مارسٹن، بین جانسن، بیومانٹ اور فلیچر، فلپ مسینجر، جان ڈرائیڈن، مسز افرا جانسن بن (پہلی انگریزی ڈراما نگار خاتون)، ٹامس شیڈول، رچرڈ برنزلے شیریڈن وغیرہ اہم ہیں۔ وکٹورین عہد میں بھی ڈرامے کو خاص ترقی حاصل ہوئی۔ اس عہد میں جارج برنارڈ شا، آسکر وائلڈ اور جان گالزوردی کو شہرت حاصل ہوئی۔

ساتویں باب میں جرمنی اور آسٹریا میں ڈرامے کی روایت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جرمنی میں سب سے پہلے دسویں صدی میں ہراتھووستا نے لاطینی میں مذہبی ڈرامے لکھے۔ اٹھارھویں صدی میں گاٹ ہولڈ لیسنگ پیدا ہوا جس نے جرمن ڈرامے کو نئے ابعاد عطا کیے۔ بعد کے زمانے میں شاعر اور ڈراما نگار گوئٹے کو اس فن میں عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ آٹھویں باب میں سویڈن اور ناروے میں ڈرامے کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ابسن، بیورسن اور اگست اسٹرانڈبرگ کی ڈراما نگاری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

نویں باب میں روسی ڈرامے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جہاں میکسم گورکی، ٹالسٹائی اور چیخوف جیسے باکمال ڈراما نگار پیدا ہوئے۔ دسویں باب میں ہالینڈ اور بلجیم اور گیارھویں باب میں امریکا میں ڈرامے کے ارتقائی سفر کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

بارھویں باب میں عہد قدیم سے بیسویں صدی کے اوائل تک کے ہندوستانی ڈرامے کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ڈرامے کی مختلف اقسام، خصوصیات، اجزائے ترکیبی، ارکان، نمائش کے طریقے وغیرہ زیر بحث آئے ہیں۔ قدیم ہندوستانی ڈرامے پر گفتگو کرتے ہوئے کالیداس، بھوبھوتی، راج شنکر وغیرہ کے ڈراموں سے متعارف کرایا گیا ہے۔ ہندوستانی ڈرامے کا جدید عہد انیسویں صدی میں شروع ہوا جس کے پیشرو امانت لکھنوی ہیں۔ امانت کی ''اندر سبھا'' جو واجد علی شاہ کے ایما پر قیصر باغ میں اسٹیج ہوئی، جدید ڈرامے کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس کے بعد پارسی اسٹیج کا زمانہ آیا جس نے ڈرامے کو نئی تب و تاب اور عوامی مقبولیت عطا کی۔ طالب بناری، احسن لکھنوی، بیتاب اور آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے اس عہد میں بہت مقبول ہوئے۔ خصوصاً آغا حشر نے اردو اور ہندی میں بے شمار ڈرامے لکھے اور اسٹیج کیے۔ دیگر ڈراما نگاروں میں سید عباس علی، حافظ محمد عبداللہ، مرزا نظیر بیگ اور منشی ابراہیم محشر انبالوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی باب میں ہندی اور بنگالی ڈرامے سے متعلق بھی واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے۔ بنگلہ میں مدھوسودن دتا اور رابندر ناتھ ٹیگور کے ڈرامے قابل ذکر ہیں۔

کتاب کے آخری تین ابواب میں ایران، چین، جاپان، عرب، ترکی، افغانستان، سیلون (سری لنکا)، افریقہ اور آسٹریلیا وغیرہ میں ڈراما نگاری کے آغاز وارتقا پر بحث کی گئی ہے۔

بہ اعتبار مجموعی یہ کتاب نہ صرف اردو ڈرامے کے فن اور روایت سے بخوبی واقف کراتی ہے بلکہ عالمی ڈرامے سے بھی قاری کو آگاہ کرتی ہے۔ اس کتاب نے نہ صرف ڈراما نگاری پر لکھنے والوں کے لیے چراغ راہ کا کام کیا بلکہ آج بھی اس کے حوالے کے بغیر ڈرامے کی تنقید و تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔

●

تعلیمی رہنمائی اور صلاح کاری/عبدالغنی مدہوش

صفحات: 192، قیمت: 67 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
مبصر: رئیس احمد

عبدالغنی مدہوش کی یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے، جس میں ابتدائی اور ثانوی مدارس میں تعلیمی رہنمائی اور صلاح کاری کے علاوہ پیشہ ورانہ صلاح کاری، منصوبہ سازی اور اسکول، جیسے موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ شعبۂ تعلیم سے وابستہ افراد اور تعلیمی بورڈ کے اراکین کے لیے نہایت مفید ہے۔ موضوع اور مواد کی وسعت واہمیت کے پیش نظر اس کتاب کو — ''رہنمائے تعلیم'' سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ صاحب کتاب نے پہلے باب میں ''تاریخی پس منظر'' کے تحت رہنمائی اور صلاح کاری کے معانی ومفاہیم اور رہبری و رہنمائی کی اہمیت و افادیت کے علاوہ تعلیم کے ساتھ ساتھ رہنمائی خدمات کے تعلق کو واضح کیا ہے، ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ صلاح کار کا اپنے پیشے میں ماہر و کامل ہونا لازمی ہے، علاوہ ازیں صلاح کار کو اسکول میں پڑھائی کے کام سے جدا رکھا جانا زیادہ بہتر ہے، تاکہ وہ پوری دلچسپی اور انہماک کے ساتھ رہنمائی اور صلاح کاری کا کام انجام دے سکے۔ مزید ایک رہنما کے لیے لازمی ہے کہ وہ نظام مدارس کے لیے درسی نصاب کو بامعنی اور مفید مطلب بنانے کے لیے اپنے

مشوروں سے بھی نوازے۔

دوسرے باب میں ”رہنمائی خدمات“ کے عنوان سے خدمت کے تصور اور اس کے وسیع دائرے سے واقف کرایا گیا ہے جس میں معلوماتی، امداد روزگار، تحقیقاتی اور صلاح کاری جیسی خدمات پر اجمالاً روشنی ڈالتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ صلاح کار کے لیے لازمی ہے کہ وہ ایک اعلیٰ کردار کا مالک ہو، چونکہ صلاح کاری ایک بڑی ذمہ داری کا پیشہ ہے، جس کے لیے ایماندار ہونا اولین شرط ہے۔

تیسرے باب میں 'ابتدائی مدارس میں رہنمائی' کے زیر عنوان ابتدائی تعلیم میں رہنمائی کی ضرورت، اہمیت، اور بچوں کی نشو و نما کے علاوہ ابتدائی اسکولوں میں رہنمائی خدمات کی ذمے داریاں، مجموعی ترقی ریکارڈ، تعلیمی کمیشن اور ابتدائی اسکولوں میں رہنمائی جیسے موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، جس کا لب لباب یہ ہے کہ ابتدائی مرحلے کی رہنمائی، ہر طرح کی رہبری اور سلامتی کا سنگ بنیاد ہے۔ اور یہ بات محض عوام، اسکول انتظامیہ اور اساتذہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ملک کی سرکار کو بھی اس پر عملاً توجہ دینا لازمی ہے کیونکہ کسی بھی طرح کی سفارشات ایک مکمل، جامع اور مرتب عملی پروگرام کے تحت ہی عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔

چوتھے باب میں ” ثانوی مدارس میں رہنمائی“ کے تحت ثانوی تعلیم، ثانوی سطح کے طلبہ کے مسائل، رہنمائی خدمات کی تنظیم اور ثانوی اسکول کے صلاح کار کی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ ثانوی اسکول میں رہنمائی سے متعلق ایجوکیشن کمیشن کی سفارشات پر بحث کی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ ثانوی اسکولوں کے اساتذہ کو رہنمائی کے اصول و ضوابط اور مبادیات سے واقفیت ضروری ہے، اس کے لیے لازمی ہے کہ ٹریننگ کالجوں میں رہنمائی اور صلاح کاری کے مضمون کا مطالعہ تمام زیر تربیت اساتذہ کے لیے لازمی قرار دیا جائے۔ پانچویں باب میں ” پیشہ ورانہ رہنمائی“ کے موضوع پر گفتگو کی گئی ہے جس میں پیشہ ورانہ رہنمائی کی تعریف، آدمی اور اس کا روزگار، انتخاب پیشہ اور انتخاب پیشہ پر اثر انداز ہونے والے عناصر کے ساتھ پیشہ ورانہ صلاح کاری و پیشہ ورانہ منصوبہ سازی اور اسکول، جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کے آخری باب ” رہنمائی پروگرام کا نظم ترتیب اور تشکیل“ میں مصنف نے بطور خاص 'رہنمائی عملہ' (جس میں پرنسپل، ہیڈ ماسٹر، کلاس ٹیچر اور صلاح کار شامل ہیں۔ ” رہنمائی کی تنظیم“ (ابتدائی مدرسہ، ثانوی اسکول، کالج کی سطح، یونیورسٹی کی سطح) اور موثر رہنمائی پروگرام کی خصوصیات (خارجی معیار، داخلی معیار) کے علاوہ رہنمائی پروگرام کا جائزہ لیا ہے جس میں وقت کی کمی، تربیت کی کمی، مالی مشکلات، پیمائش قدر کے طریقے، سروے کا طریقہ اور تجرباتی طریقہ جیسے اہم موضوعات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، اس کے علاوہ انفرادی ملاقاتوں اور مشاہدوں کی افادیت بھی بیان کی گئی ہے۔

عبدالغنی مدھوش کی یہ کتاب اساتذہ اور طلبہ و طالبات کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہے۔ زیر تربیت اساتذہ اور معلمین کے لیے یقیناً یہ کتاب ایک ” رہنما“ ثابت ہوگی۔ امید کہ آئندہ ایڈیشن میں خال خال مقامات پر پائی جانے والی پروفنگ کی اغلاط دور کرلی جائیں گی۔

•

پوکے مان کی دنیا/مشرف عالم ذوقی

صفحات: 336، قیمت:-/250 روپے (مجلد)، -/200 روپے (غیر مجلد)

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-110006

مبصر: فیروز عالم

” پوکے مان کی دنیا“ مشرف عالم ذوقی کا نیا ناول ہے جس میں ایک نئے موضوع سے قارئین کو متعارف کرایا گیا ہے۔ عالمیت، ٹی وی چینلوں کی بھرمار اور کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے جس طرح نئی نسل کے ذہن و فکر پر اپنا قبضہ جما لیا ہے اور اس سے جو منفی اثرات معاشرے پر مرتسم ہو رہے ہیں اس کی عکاسی اس ناول میں بخوبی کی گئی ہے۔ آج والدین کے پاس بچوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ وہ دفتر، کاروبار اور دیگر امور میں اس قدر مصروف ہیں کہ انھیں پتہ نہیں کہ ان کے بچے کیا کر رہے ہیں اور ان کی زندگی کون سا رخ اختیار کر رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سائبر عہد کے بچے نہ صرف عمر سے پہلے جوان ہو رہے ہیں بلکہ ان کے ہوش و حواس پر جنس غالب آتی جارہی ہے۔ آج کل بچے دھڑلے سے بلیو فلمیں اور فحش ویب سائٹس دیکھ رہے ہیں اور عملی زندگی میں بھی اسے اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ” بھارت میں بھی جیسے جیسے لوگ کمپیوٹر لٹریٹ ہوتے جارہے ہیں، سائبر کرائم بڑھتا جارہا ہے— فنانشیل ٹریفکنگ — پائریسی، ہیکنگ — سائبر Terrorism — پورنوگرافی اور سائبر اسٹاکنگ — یہ سب نئے نئے سائبر کرائم کی شکلیں ہیں۔
>
> ....دنیا بھر میں 60 ہزار سے بھی زیادہ ایسے سائٹس ہیں جو بچوں تک کو آن لائن پورنوگرافی سے تباہ کر رہے ہیں۔ ان کا سب سے برا اثر معصوم بچوں پر پڑتا ہے جو جانے انجانے ایسے سائٹس کو کلک کر دیتے ہیں۔ پھر ان کا تجسس ایسے سائٹس کے لیے بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے سائٹس بچوں کو Sexual کرائم کی طرف اکساتے ہیں۔“ (پوکے مان کی دنیا۔ ص۔ 235)

ناول کے مرکزی کردار سنیل کمار رائے جو ایک جج ہیں، ان کے سامنے ایسا ہی ایک کیس آتا ہے۔ بارہ سال کا روی کنچن اور اس کی ہم عمر اور ہم جماعت سونالی اپنے گھر میں بلیو فلم دیکھتے ہیں اور پھر وہ بھی وہی سب کچھ کر بیٹھتے ہیں۔ سونالی کے ماں باپ کو جب اس کا پتہ چلتا ہے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ سونالی کا باپ جے چنگی رام ایک دلت ہے اور ایک سیاسی جماعت کا سرگرم کارکن ہے۔ وہ سیاسی جماعت اسے مشورہ دیتی ہے کہ اس معاملے کا سیاسی فائدہ اٹھائے۔ جے چنگی رام اپنا کیریئر بنانے کے لیے پارٹی کے مشورے پر عمل کرتا ہے جس کی وجہ سے شوہر اور بیوی کے تعلقات خراب ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جج سنیل کمار رائے پر اس سیاسی جماعت کے ایک وزیر کی طرف سے دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ بچے کو زنا بالجبر کا مجرم قرار دے کر اسے سخت سے سخت سزا دیں۔ سنیل کمار رائے معاملے کی تہہ میں جانے کے لیے ریفارم ہاؤس میں بچے سے ملاقات کرتے ہیں اور حقیقت جاننے کے بعد بچے کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ مقدمے کا فیصلہ سناتے وقت وہ اپنے ضمیر کی آواز سنتے ہیں۔

"روی کنچن بے قصور ہے اور اس پورے معاملے کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ایک چھوٹے سے پوکے مان کی غلطی کو نظر انداز کرنے میں ہی ہم سب کی بھلائی ہے — لیکن اس کے باوجود کوئی نہ کوئی مجرم ضرور ہے، اور جو مجرم ہے، اسے سخت سے سخت سزا تو ملنی ہی چاہیے۔ اس لیے ……

میں پورے ہوش و حواس میں یہ فیصلہ سناتا ہوں کہ تعزیرات ہند دفعہ 302 کے تحت — میں اس نئی ٹیکنالوجی، ملٹی نیشنل کمپنیز، کنزیومر ورلڈ اور گلوبلائزیشن کو سزائے موت کا حکم دیتا ہوں — ہینگ ٹو ڈیتھ۔"

(پوکے مان کی دنیا۔ ص-330)

ایک ادیب یا شاعر اپنے معاشرے کا حساس ترین انسان ہوتا ہے۔ اپنے آس پاس ہونے والے واقعات و حادثات کا وہ سب سے زیادہ اثر لیتا ہے اور اسے اپنی تخلیق کا حصہ بناتا ہے۔ ہندوستان پر مغربی تہذیب کے بڑھتے اثر سے سب سے پہلے اکبر الہٰ آبادی نے اپنی شاعری کے ذریعے خبردار کیا تھا۔ آج عالمیت اور انٹرنیٹ کے طفیل ہندوستانی معاشرہ نئے مسائل سے دوچار ہے۔ پرانی قدریں فرسودہ قرار دی جا رہی ہیں۔ شرم و حیا، بزرگوں کا احترام اور اخلاقیات سے ہماری نئی نسل بے بہرہ ہے — اور اس کے لیے والدین بھی کم ذمے دار نہیں۔ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہے ہیں یا ان کے پاس وقت نہیں کہ وہ بچوں کے ساتھ بیٹھ سکیں، ان کی اچھی تربیت کر سکیں، صحیح اور غلط کا فرق واضح کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نئی نسل بے راہ روی کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ پرانی اور نئی نسل کے درمیان دوری مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ جنریشن گیپ تو ہمیشہ رہا ہے لیکن موجودہ دور میں یہ مہیب صورت اختیار کر چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہار کے ایک چھوٹے سے شہر گوپال گنج کا سنیل کمار رائے دہلی میں رہ کر بھی میٹروپولیٹن کلچر کا حصہ نہیں بن پایا ہے لیکن اس کی بیٹی ریا اور بیٹا متن آزاد پنچھی کی طرح اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ ریا اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ آزادانہ اسی گھر میں رہتی ہے۔ شروع میں سنیل کمار رائے احتجاج کرتا ہے لیکن آہستہ آہستہ حالات کے آگے سپر ڈال دیتا ہے۔ لیکن یہ صورت حال اسے کچوکے لگاتی رہتی ہے۔

پرانی سنسکرتی بدل رہی ہے۔ ایک نئی سنسکرتی وجود میں آرہی ہے جس کا جنم داتا سائبر ورلڈ اور صارفی سماج ہے۔ پوکے مان کارڈ سے کھیلنے، طرح طرح کے کارٹون دیکھنے اور ویب سائٹ پر فحش تصویریں دیکھنے والے بچوں سے ان کا بچپن چھن رہا ہے۔ وہ گناہوں اور جرائم کی دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں۔ انھیں بچانے کے لیے صرف نئی ٹیکنالوجی، ملٹی نیشنل کمپنیوں، کنزیومر ورلڈ اور گلوبلائزیشن کو ہی سزائے موت دینے کی ضرورت نہیں ہے، ووٹ بینک کی سیاست کرنے والی سیاسی جماعتوں، خبروں کو سنسنی خیز بنانے کے چکر میں معصوموں کی زندگی تباہ کرنے اور گھروں کو اجاڑنے والے ٹی وی چینلوں اور بچوں کی تربیت پر توجہ دینے کے بجائے ہوٹلوں اور پارٹیوں میں اپنا وقت صرف کرنے والے والدین بھی کم خطاوار نہیں۔

مشرف عالم ذوقی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے موجودہ دور کے ایک اہم مسئلے پر قلم اٹھایا ہے اور اس کی تمام جزئیات پر گہری نگاہ ڈالی ہے۔

●

آل احمد سرور کے تبصرے / محمد ضیاء الدین انصاری

صفحات: 271، قیمت: -/130 روپے
ناشر: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
مبصر: شہاب ظفر اعظمی

پروفیسر آل احمد سرور کے بغیر جدید اردو تنقید کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ ان کے تنقیدی خیالات کی تفہیم کے لیے ان کے مضامین اور کتابوں کے دیباچوں کا مطالعہ بھی اہم ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کے تبصروں، اداریوں اور خطوط کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو ان کے تنقیدی افکار و نظریات سے بخوبی واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے کیوں کہ انھوں نے اپنے تنقیدی موقف اور تصور تنقید کے سلسلے میں اپنے ان تبصروں اور اداریوں میں اہم مباحث قائم کیے ہیں۔ انھوں نے ان تبصروں میں اس امر کا خیال رکھا ہے کہ وہ قاری کے سامنے نہ صرف اپنے ادبی موقف کا اظہار کریں بلکہ اس ادبی سیاق کو بھی پیش کر دیں جس ادبی سیاق میں زیر تبصرہ کتاب لکھی گئی ہے۔ ان تبصروں کے مطالعے سے قاری کو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ پروفیسر آل احمد سرور کا ادب و فن کے تئیں رویہ کیا ہے اور وہ ادب یا کسی مخصوص صنف کی مجموعی صورت حال سے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟ مگر قاری کو ان کی رائے یا تنقیدی فکر کے متعلق حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ وہ ان

کی تنقیدی بصیرتوں اور خیالات کو کسی مخصوص نظریاتی آئینے میں نہ دیکھیے کیوں کہ سرور نے اپنی زندگی میں کبھی کسی مخصوص آئیڈیالوجی کو نہ اپنا مطمح نظر بنایا اور نہ ہی کسی مخصوص نظریے تک محدود رہے۔ ان کے تنقیدی موقف کا امتیازی وصف ان کی وسیع المشربی اور وسیع النظری ہے۔ ان کی بالغ نظری، ادبی بصیرت، مطالعے کی وسعت اور ادبی ذوق کی بالیدگی نے مختلف افکار و نظریات سے خوشہ چینی میں ان کی رہبری بھی کی اور متضاد رجحانات میں توازن بھی قائم کیا۔ ان کے بیشتر تبصروں میں اس اعتدال و توازن کا احساس موجود ہے۔

زیر نظر کتاب میں مرتب نے آل احمد سرور کے ساٹھ (60) تبصروں کو شامل کیا ہے جن میں کچھ تبصرے ایک صفحے کے ہیں تو کچھ باقاعدہ طویل مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اصناف کا تنوع بھی تبصروں کو وقیع بناتا ہے جس میں ناول، افسانہ، شاعری، تنقید، صحافت اور سوانح شامل ہے۔

سرور صاحب زیر تبصرہ کتاب کی محض خوبیوں یا صرف خامیوں پر روشنی نہیں ڈالتے۔ انھوں نے ہر قسم کی مروت و مصلحت سے بلند ہو کر معروضی انداز میں کتابوں کے ادبی محاسن و معائب پر اظہار خیال کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتاب " ذاتی ڈائری کے چند ورق" پر ان کا تبصرہ دیکھیے۔

" مولانا عبدالماجد اشارے کی جگہ دفتر پیش کردیتے ہیں اور جہاں دل کھول کر لکھنے کی ضرورت ہے وہاں قلم کی ایک سرسری جنبش سے کام لیتے ہیں۔ ان کا طرز تحریر باوجود اپنی مقبولیت کے نثر کا اچھا اسلوب نہیں ہے۔ یہ ذہن میں روشنی نہیں کرتا، جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے یہ معرفت نہیں ایک سستا نشہ عطا کرتا ہے اسی لیے یہ ڈائری باوجود نظر ثانی اور اضافے کے ایک بڑا ادبی کارنامہ نہیں ہو پائی۔ ادب میں بڑائی افکار کی گہرائی اور گیرائی سے آتی ہے۔ مولانا کے یہاں شدید اور گہرے جذبات ہیں، افکار کی گہرائی ان کے بس کی بات نہیں۔ مولانا عبدالماجد کی طرز تحریر اردو نثر کے لیے ایک خطرہ ہے۔" (ص۔ 189)

پروفیسر آل احمد سرور نے تبصرہ نگاری کو ایک سنجیدہ فن کے طور پر برتا ہے۔ ان کے تبصروں میں جہاں کسی تصنیف کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے وہاں اس کا جواز موجود ہے۔ خواجہ احمد فاروقی کی تصنیف " میر تقی میر حیات اور شاعری" پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" فاروقی صاحب میر کی عظمت کے راز تک پہنچ گئے ہیں۔ انھوں نے درست کہا ہے کہ میر کی شاعری کے پیچھے ادب اور سماج اور جینت، جذبہ اور فکر کا وہ گہرا رشتہ ہے جو تاریخی سچائیوں میں حسن اور زندگی پیدا کردیتا ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری صرف عشقیہ نہیں ہے۔ یہ خودداری، اخلاقی عظمت، دلگدازی اور دردمندی کا صحیفہ بھی ہے۔ ان کا عشق ایک تہذیبی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں گہرا جنسی جذبہ ہے مگر جنسی جذبے کے ارتفاع سے ہی بڑی شاعری وجود میں آتی ہے۔ ہر جگہ یہ جذبہ ارتفاع نہیں پیدا کرسکا اس لیے ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں ہے جو ادب و اخلاق کی نگاہوں میں کھٹکتے ہیں مگر کثافت اور لطافت میں جو تعلق ہے اسے نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ فاروقی صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ نہ تو کثافتوں سے انکار کرتے ہیں نہ انھیں لطافت کہنا چاہتے ہیں بلکہ دونوں کا احساس و عرفان رکھتے ہیں۔" (ص۔218)

ضیاء الدین انصاری نے آل احمد سرور کے اہم تبصروں کو یکجا کرکے ایک بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے۔ قوی امید ہے کہ اس کتاب کی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔

□□□

مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی تب و تاب عطا کی اور ایک منفرد لب و لہجے سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہوسکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کے حالات زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلام دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ذریعے اس تشنگی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 592، قیمت:-/258 روپے

کلیاتِ علی سردار جعفری (جلد اوّل)

مرتب: علی احمد فاطمی

علی سردار جعفری ایک شاعر، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، صحافی، نقاد، مفکر اور دانشور ہی نہیں ادب، تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے گہرے رمز شناس بھی تھے۔ کونسل نے ان کی تمام تحریروں کو کلیات کی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں کلیات علی سردار جعفری کی پہلی جلد حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس میں ان کے مجموعہ ہائے کلام " پرواز"، " نئی دنیا کو سلام"، " خون کی لکیر" اور " امن کا ستارہ" شامل ہیں۔

صفحات: 496، قیمت:-/164 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1 ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مصنف: دیپاولی دیب رائے ''ہمارے رہنما'' سے اقتباس بچوں کا گوشہ

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انھیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب "ہمارے رہنما" جلد نہم سے اقتباس پیش کیا جارہا ہے۔ اس کتاب میں ان تمام قومی رہنماؤں کی حیات و خدمات سے واقف کرایا گیا ہے جنھوں نے ملک و قوم کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ "ہمارے رہنما" کی اس جلد میں سرسید احمد خاں، وویکانند، مدن موہن مالویہ، جے بی کرپلانی اور وجے لکشمی پنڈت سے متعارف کرایا گیا ہے۔ 162 صفحات پر مبنی اس کتاب کی قیمت صرف -/35 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی کتابوں پر طلبہ اور اساتذہ کو 40 فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

ایشور چند ودّیا ساگر

فرانسیسی انقلاب سے پہلے چارلس ڈکنز نے کہا تھا'' یہ بہترین وقت تھا یہ بدترین وقت تھا'' ہم اسی طرح سے ہندوستان میں انیسویں صدی کے آخری نصف حصے کو بیان کرسکتے ہیں۔ ایسی رسومات جو بے معنی ہوگئی ہیں۔ ترقی کے راستے میں حائل تھیں خاص طور پر عورتوں سے متعلق رسوم جن کی وجہ سے راستے میں حائل تھیں خاص طور پر عورتوں سے متعلق رسوم جن کی وجہ سے عورتیں جہالت اور عدم کفالت کے حالات میں مبتلا رکھی جاتی تھیں۔ ایک غیر ملکی طاقت، ملک کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھی۔ اس طرح تباہی کی شروعات یقینی تھی۔ اس اتھل پتھل میں نئے خیالات اور نظریات جڑ پکڑنے لگے۔ آزادی کا جذبہ زور مارنے لگا۔ اور بلند قامت لوگ پیدا ہونے لگے۔

ایشور چند ودّیا ساگر ایسے بڑے لوگوں میں سے ایک تھے۔ وہ 26 ستمبر 1820 میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ٹھاکر داس تھا اور ماں کا نام بھاگوتی دیوی تھا۔

ایشور چندر، اپنے لقب ودیا ساگر سے ہی اس قدر جانے پہچانے جاتے ہیں کہ ان کے خاندانی نام بندو پادھیائے کو لوگ بھول گئے۔ ان کا تعلق ایک علم دوست مگر غریب خاندان سے تھا۔

ایشور چند کے دادا رام جایا ایک سنسکرت کے عالم تھے جنھیں ترکا بھوشن کا خطاب ملا تھا۔ یہ ایک جری، سچا اور مادی فائدے سے بے پروا انسان تھے۔ وہ درویش بنے سارے ملک میں پھرتے رہے۔ ان کی بیوی درگا، کلکتے سے 84 کلومیٹر دور ضلع مدناپور کے گاؤں ورسمہا میں اپنے والد کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوگئیں۔ ان کے بھائی نے ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا بلکہ انھیں یہ احساس دلایا کہ وہ ان پر بوجھ بن گئی ہے۔ وہ اپنے والد کی زمین پر ہی مگر ذرا دور ہٹ کر ایک جھونپڑی میں منتقل ہوگئیں اور چرخے پر سوت کات کر گزر بسر کرنے لگیں۔ ایشور چندر کے باپ ٹھاکر داس ان کے بڑے بیٹے تھے اپنی ابتدائی زندگی میں جب کہ وہ 14 برس کے تھے ٹھاکر داس کو اپنے خاندان کو سہارا دینا پڑا۔ وہ کلکتہ میں ایک تاجر کے پاس ایک معمولی بل کلرک کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور ورسمہا پیسے بھیجتے تھے۔

ان کی بیوی درگا دیوی ایک غیر معمولی شخصیت کی مالک تھیں۔ وہ سخی اور رحم دل عورت تھیں اور کبھی کسی فقیر کو اپنے دروازے سے کچھ دیے بغیر نہیں لوٹاتی تھیں ساتھ ہی گاؤں میں سب ہی گھروں کی فکر رکھتی تھیں۔ یہ بات اس لیے بھی خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ وہ خود بہت غریب تھیں۔ اور خیرات کے لیے کچھ پیسے

ہوتے بھی نہیں تھے۔

وہ اپنے نانا سے بہت قریب تھیں۔ ان کے نانا بھی سنسکرت کے عالم اور اپنی بیٹیوں اور ان کے بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ اور نہایت شفقت سے پیش آتے تھے۔ اس زمانے میں لڑکیوں کی شادی بہت چھوٹی عمر ہی میں کردی جاتی تھی۔ اس کے بعد انھیں بہت کم عرصے کے لیے ہی میکے آنے کی اجازت تھی۔ اگر وہ زیادہ عرصے تک قیام کرلیتی۔ یا بیوہ ہوکر لوٹتیں یا ناپسندیدہ ہوکر لوٹا دی جاتیں تو عام طور پر ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ باپ بچی کو اپنے اوپر ایک بوجھ خیال کرتے تھے اور کسی نہ کسی طرح سے شادی کرکے یہ بوجھ دوسرے گھر پر ڈالنا چاہتے تھے۔

بھاگوتی کے نانا، اس طرح کے رویے سے نمایاں طور پر پاک تھے۔ وہ اکثر اپنے بچوں کے ساتھ ان کے گھر جاکر مہینوں رہا کرتی تھیں۔ ان کے نانا اور ان کے بعد ان کے ماموں، نے ہمیشہ ان کے ساتھ محبت اور شفقت کا ہی برتاؤ کیا۔ ایشور چندر جب 6 سال کے تھے شدید بیمار ہوگئے۔ بھاگوتی کے ماموں انھیں اپنے گھر لے گئے اور اپنے علاقے کے بہترین ڈاکٹروں سے علاج کروایا۔

ان کے نانا کا کردار اور مادی زندگی سے لاتعلقی اور ان کے والد کا احساس ذمے داری، ان کی ماں کی کشادہ دلی اور وہ ہمدردانہ رویہ جو ان کے نانا اور ماموں لڑکیوں کے تعلق سے رکھتے تھے، ان سب خوبیوں نے ایشور چندر ودیا ساگر کو ایک عظیم انسان بنادیا۔

بچپن

ایشور چندر کو ورسمہری سمہا شیشو (Versimheri Simha Shishu) (ورسمہا کا شیر بچہ) کہا جاتا تھا۔ جب ان کی ولادت ہوئی تو اس بندھو اپادھیاوں کے گھر میں اتفاق سے اسی دن ایک بچھڑا بھی پیدا ہوا تھا، ان کے نانا نے غلطی سے ایشور چندر کی پیدائش کو، ایک، بچھڑے کے پیدا ہونے کی خبر سمجھا اس طرح اس گھرانے میں یہ لطیفہ عام ہوگیا کہ ایشور چندر آدمی کا بچہ نہیں بلکہ ایک بیل کا بچھڑا ہے یہ بات اس لیے بھی عام ہوگئی کہ ایشور چندر بچپن میں ضدی اور شریر تھے۔ ان کے والد کو بھی یہ احساس ہوگیا تھا کہ ان کا مضبوط جثے والا ضدی لڑکا ہمیشہ وہی کرتا ہے جو نہ کرنے کی ہدایت دی جائے۔ اس لیے انھوں نے وہ طریق کار ڈھونڈنے شروع کیے جن سے ایشور چندر وہی کرسکے جو ٹھاکر داس چاہتے تھے۔

ایشور چندر، اپنے سات بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان کی تین بہنیں بھی تھیں۔ دو بھائی بچپن ہی میں ہیضے کی بیماری سے فوت ہوگئے۔ دوسرے دو بھائی، شمبھو چندر نارائن اور دینا بندھو نیائے رتن، بڑے ہوکر عالم بنے۔ یہ دونوں ایشور چندر سے بہت قریب ہوگئے کیونکہ خود ایشور چندر کو ان سے محبت تھی۔

ایشور چندر مضبوط جسم کے لڑکے تھے، انھیں کبڈی کھیلنا اور لاٹھی چلانا پسند تھا۔ اگرچہ وہ عادتاً شریر تھے مگر جب انھیں پاٹھ شالا میں ڈالا گیا تو وہ پڑھنے لکھنے میں بھی خوب دلچسپی لینے لگے۔

طالب علمی کی زندگی

1828 میں ایشور چندر اپنے والد کے ساتھ کلکتہ آئے ٹھاکر داس چاہتے تھے کہ ایشور چندر اپنی خاندانی روایات برقرار رکھتے ہوئے سنسکرت کے عالم بن جائیں مگر ایشور چندر اس قدر ذہین تھے کہ شہر میں چلتے پھرتے، میل کے پتھروں سے انگریزی ہندسے سیکھ گئے۔ اس بات نے ان کے خاندان کے بڑے لوگوں کو بھی متاثر کیا۔ ان میں سے بعض نے مشورہ دیا کہ ایشور چندر کو کلکتہ میں ہندو کالج میں داخلہ لینا چاہیے تاکہ وہ انگریزی کا علم حاصل کرسکیں۔ مگر ایشور چندر کو سنسکرت کالج میں داخلہ دلایا گیا جہاں ہندوستانی اور مغربی فکر کو جوڑنے والا سنسکرت اردو انگریزی کا مشترکہ نصاب دستیاب تھا۔ اس انتخاب نے بھی ان کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔

ایک بڑے اجنبی شہر میں تعلیم پاتے وقت ایشور چندر کو دو وقت کی روٹی پیدا کرنا ایک سخت جدوجہد کا مرحلہ تھا۔ وہ اپنے باپ کے مالک کے گھر میں رہے۔ اسی گھر کی بنی ریمونی جو اس مکان میں رہتی تھی۔ اس غریب طالب علم پر مہربان تھی۔ اس وجہ سے ایشور چندر کے دل میں عورت کی عزت پیدا ہوئی۔ جہاں تک کھانے

پینے کا سوال تھا وہ انتہائی کم خوراک تھے۔ ٹھاکر داس جو مالی مدد کرتے تھے وہ واضح طور پر ناکافی تھی۔ اکثر انھیں صرف ابلے ہوئے چاول ملتے تھے۔ بعض اوقات تو انھیں ان چاولوں کے بغیر بھی دن کاٹنے ہوتے تھے وہ صرف کھادی کی دو چادریں اوڑھا کرتے تھے جو ان کی ماں نے ان کے لیے بُنی تھیں۔ مگر کچھ دنوں بعد ہی ان کے بھائی دین بندھو کلکتہ آکر ان کے ساتھ رہنے لگے۔

ان حالات میں بھی ایشور چندر کالج کے اپنے جیسے کمزور اور غریب ساتھیوں کی مدد کیا کرتے تھے یہ ان کے لیے جو ان کے ساتھ رہتے تھے۔ بازار سے سودا سلف لے آتے تھے کھانا پکانے اور برتن صاف کرنے میں بھی ان کی مدد کرتے تھے۔ راستے میں وہ کتاب کھول کر مطالعہ کرتے ہوئے چلتے تھے۔ وہ رات دیر گئے پڑھتے رہتے تھے اگر نیند بھی آتی تو آنکھوں پر تیل مل دیا کرتے تھے اور اگر گھر میں جلانے کے لیے تیل نہیں ہوتا تو راستے کی روشنی میں پڑھا کرتے تھے۔ وہ اپنی چوٹی دالان کے کھمبے سے باندھ دیتے تھے تاکہ اگر نیند کا جھونکا آئے تو جھٹکا لگے اور وہ جاگ جائیں ٹھاکر داس جب دن بھر کے کام سے تھک کر گھر آتے اور ایشور چندر کو اونگھتے دیکھتے تو ان کی خوب پٹائی بھی کرتے۔

کٹھن جد و جہد کی یہ زندگی تھی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح ایشور چندر نے بارہ برس کاٹ دیے۔ ساڑھے تین برس تک وہ گرامر کلاس میں رہے۔ پھر مزید تین برس ادب [illegible] کلاس میں رہے۔ انھوں نے زیادہ تر تعلیمی وظیفے اور انعامات حاصل کیے جو سنسکرت کالج میں دیے جاتے تھے اور انھیں ایک غیر معمولی صلاحیتوں والا طالب علم قرار دیا گیا تھا۔

متعلم (اسکالر)

ودیا ساگر کی ایک اسکالر کی حیثیت سے بڑھتی ہوئی شہرت سے متاثر ہو کر کھر پئی گاؤں کے ایک صاحب حیثیت برہم شترو گھن بھٹا چاریہ نے ٹھاکر داس سے مل کر اپنی بیٹی دناموئی سے ایشور چندر کے بیاہ کی تجویز پیش کی۔ ٹھاکر داس راضی ہو گئے۔ اگرچہ ایشور چندر صرف چودہ برس ہی کے تھے اور شادی کے خیال کی طرف مائل بھی نہیں تھے باپ کے کہنے پر آمادہ ہو گئے اور 8 سالہ دناموئی سے شادی کر لی۔ اس کے بعد بھی ایشور چندر نے کلکتہ میں اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔

اپنی ان خصوصی ذہانت اور کارکردگی کے پیش نظر انھیں، سنسکرت کالج سے پوری طرح فارغ التحصیل ہونے سے قبل ہی ودیا ساگر (علم کا سمندر) کے خطاب سے نوازا گیا۔

1839 میں انھوں نے ہندو قانون (Hindu Law) کا امتحان پاس کیا اور ہندو فلاسفی کی تعلیم حاصل کرنے لگے 1841 میں انھوں نے سنسکرت کالج میں تکمیل تعلیم کی سند حاصل کی۔ خواہ سنسکرت گرامر کا معاملہ ہو کہ سنسکرت ادب کا میدان یا ہندو شاستروں کا میدان، ایشور چندر ہر شعبے میں طاق اور ماہر تھے۔ انھوں نے اپنے اس علم کا اس وقت بھرپور استعمال کیا جب وہ سماجی اصلاح کے پروگرام سے وابستہ ہو گئے۔ ساتھ ہی وہ کسی ہندو دیوی دیوتا کے معتقد نہیں رہے حتیٰ کہ علم کی دیوی سرسوتی سے بھی انھیں کوئی عقیدت نہ تھی۔ ایشور چندر پر سب سے زیادہ اثر ان کے ماں باپ کا تھا اور ان کے دل میں ان کے لیے بڑی محبت و عقیدت تھی۔ جوں ہی ایشور چندر کو ملازمت ملی انھوں نے اپنے والد کو واپس گاؤں لوٹ جانے اور آرام کرنے پر اصرار کیا۔ اور خود کام کر کے پیسے گاؤں بھیجتے رہے۔

ایشور چندر نے جس طور سے وقف ہو کر ماں کی خدمت کی وہ بنگال میں مثال بن گئی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار ان کی ماں نے انھیں ایک خاص دن پر گھر آنے کے لیے کہا۔ ایشور چندر اپنی عادت کے مطابق کلکتہ سے گاؤں کے لیے پیدل روانہ ہوئے گاؤں پہنچنے کے لیے انھیں دریائے دامودر پار کرنا پڑتا تھا۔ جب ایشور چندر دریا پر آئے تو اندھیرا ہو چکا تھا طوفان اٹھ رہا تھا، پانی میں تلاطم تھا۔ ایسے میں دریا پار کرنے کی کوشش کرنا محض نادانی تھی۔ ایسے حالات کے باوجود ایشور چندر کو اس خیال سے تکلیف ہوتی تھی کہ اگر وہ نہ گئے تو ان کی ماں کو انتظار کی گھڑیاں کاٹنا پڑیں گی اس خیال کے آتے ہی انھوں نے ایک آواز لگائی ماں اور چڑھتے ہوئے دریا میں کود پڑے۔ انھوں نے جیسے تیسے دریا کو پار کیا اور اسی رات ماں کے پاس پہنچ گئے۔ ایشور چندر مذہبی روک ٹوک سے آزاد تھے۔ مذہبی محفلوں اور مباحثوں میں کبھی شریک نہیں ہوتے تھے۔ انھوں نے والدین کو اپنا وشویشور اور اناپورنا قرار دیا ہے۔ وہی ان کے لیے زندہ دیوی دیوتا تھے۔ 1853 میں جب انھوں نے ورسمہا میں ایک نائٹ اسکول شروع کیا تو انھوں نے پھر اپنے لائق اور چاہنے والا سپوت ہونے کا ثبوت دیا کہ انھوں نے اسکول کو اپنی ماں بھاگوتی دیوی کے نام

سے موسوم کیا۔ اسکول کی کوئی فیس نہیں تھی، کتابیں بھی مفت ملا کرتی تھیں ساتھ ہی ناشتہ بھی مفت دیا جاتا تھا۔

ان پر جس دوسری شخصیت کا اولین اثر تھا وہ تھی ورسمہا کے ان کے پہلے استاد کالی کنٹھ چٹوپادھیائے کی ذات جب بھی ایشور چندر گاؤں جاتے تو اپنے بزرگ استاد کے لیے ایک نئی دھوتی ضرور لے جاتے۔ مذہبی کتابوں کے مطابق:

Pilridevo bhava matri devo bhava acharyadev bhava اپنے والدین اور استادوں کو دیوی دیوتا سمجھو ایشور چندر کے دل میں ان کے لیے جو احترام تھا وہ ان کے خیال کے مطابق، شاستروں کی تعلیمات کے عین مطابق تھا۔ تاہم یہ اندھی عقیدت نہ تھی۔ ایک بار جب وہ گاؤں آئے تو انھیں معلوم ہوا کہ ان کے بوڑھے استاد جن کی عمر تمام ہو رہی تھی۔ نو سال کی ایک لڑکی سے شادی کرنے جا رہے تھے۔ ان دنوں ایسی باتیں قانوناً اور سماجی طور طریقوں کے لحاظ سے جائز تھیں اور بہت عام تھیں۔ استاد کے لیے احترام کا جذبہ رکھنے کے باوجود ودیا ساگر کو یہ سن کر شدید صدمہ پہنچا۔ پھر انھوں نے ان سے دوبارہ کبھی نہ ملنے کی قسم کھائی۔

جوں ہی ایشور چندر نے سنسکرت کالج سے تکمیل تعلیم کی سند حاصل کی۔ فورٹ ولیم کالج کے سکریٹری کپتان (G.T.Marshal) نے انھیں بنگالی شعبے کے سرشتہ دار (ہیڈ پنڈت) کی ملازمت کے لیے منتخب کرلیا۔ ان دنوں اس کام کی تنخواہ 50 روپے ماہانہ تھی۔ وہاں انھیں انگلینڈ سے آئے ہوئے زیر تربیت عہدیداروں کو پڑھانا پڑتا تھا۔ انھوں نے اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی انگریزی اور ہندی بھی بہتر بنالی۔ کالج کے باقاعدہ طلبہ کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ ایشور چندر دوسروں کو سنسکرت گرامر مفت سکھایا کرتے تھے۔

ایشور چندر نے پڑھانے کا ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا جو دوستانہ اور جدید تھا۔ اس میں مزید اضافے کے ساتھ یہ ایک کتاب کی شکل اختیار کر گیا جو بعد میں Upakramanika کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ بنگالی زبان میں، سنسکرت گرامر سکھانے والی ابتدائی کتاب تھی جس میں طلبہ کے لیے کافی مثالیں اور مشقیں تھیں۔ دوسری کتاب جو انھوں نے تصنیف کی وہ Mugdhabodh تھی بابو پادیوا کی سنسکرت گرامر جسے بنگالی میں Vyakarana Kaumudi کا نام دیا گیا جب کالج میں اسسٹنٹ سکریٹری کی آسامی خالی ہوئی تو کیپٹن مارشل نے ایشور چندر کو اسے قبول کرنے پر آمادہ کرلیا۔

1847 میں ایشور چندر نے اپنے منصب سے استعفادے دیا اور ایک پرنٹنگ پریس شروع کیا۔ 1849 میں مارشل نے انھیں 80 روپے کے مشاہرے پر فورٹ ولیم کالج میں ہیڈ ماسٹر اور خازن کی حیثیت سے مقرر کردیا۔ دوسرے سال، ایشور چندر، لڑکیوں کے ایک پبلک اسکول کلکتہ فیمیل اسکول کے اعزازی سکریٹری بن گئے۔ انھوں نے طالب علموں کے بستوں پر Mohanirvatantra کا یہ کلمہ Kanyapyevam Palaniya Shikshaniyati Yatnatah (لڑکیوں کی بھی پرورش اور تعلیم و ترتیب بڑی توجہ اور محبت سے کرنی چاہیے) نقش کروادیا۔ 30 برس کی عمر میں وہ ایک بچے کے باپ بنے جس کا نام نارائن چندر رکھا گیا۔ اس کے بعد انھیں چار لڑکیاں نصیب ہوئیں۔ جن کے نام تھے ہیم لتا، کمودنی، بنودنی اور شرت کماری۔

عوامی مسائل

1864 میں ایشور چندر کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن اور جرمن اورینٹل سوسائٹی کا اعزازی ممبر منتخب کرلیا گیا۔ 1866-67 میں بنگال اور اڑیسہ کے بعض حصوں میں قحط پڑا۔ ایشور چندر نے اپنی ماں کی مدد سے جلد ہی ورسمہا گاؤں میں قحط سے پریشان حال لوگوں کی امداد اور راحت کے لیے ایک مرکز قائم کیا۔ 1869 میں بردوان میں ملیریا کی وبا پھیل گئی۔ ودیا ساگر وہاں پہنچے اور خیراتی دواخانے قائم کیے۔

ان کے ابتدائی زمانے کے نیم فاقہ کشی نے انھیں اب کمزور کردیا تھا۔ ساری عمر وہ تیزابیت اور بدہضمی میں مبتلا رہے۔ 16 دسمبر 1866 کو کلکتہ میں گلیوں میں وہ ایک حادثے کا شکار ہوگئے۔ اس کے بعد انھیں ایک طویل عرصے تک مختلف تکلیف دہ امراض معدہ میں مبتلا رہنا پڑا۔

ان کی سماجی اصلاحات کی کوششیں سخت جدوجہد کے مرحلے سے گزرنے لگیں تھیں۔ ایشور چندر کو چند پڑھے لکھے لوگوں کی مدد ملی مگر عوام جن پر پنڈتوں، پروہتوں اور زمین داروں کا غلبہ تھا انھوں نے ان کو نہیں پہچانا۔ رفتہ رفتہ بیواؤں کی دوبارہ شادی کے معاملات میں بھی اگرچہ وہ قانوناً جائز قرار دی گئی تھیں مگر بہ حیثیت مجموعی زیادہ جوش و خروش باقی نہ رہا۔ خود ایشور چندر کو اب محسوس ہونے لگا کہ جو کچھ کار خیر انھوں کیا تھا وہ آتش بازی سا ہو کر رہ گیا ہے۔ ورسمہا میں انھوں نے

جو اسکول کھولا تھا اسے بند کرنا پڑا کیونکہ بچوں کو کام پر جانا ہوتا تھا اس لیے وہ اسکول نہیں آسکتے تھے اس کے علاوہ خاندانی مسائل بھی تھے۔ 1869 میں ایشور چندر نے اپنی ماں کے پاس جانا بھی بند کردیا جنھیں وہ بے حد چاہتے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا جس نے اپنے آپ کو اس شہر سے نکال باہر کیا ہے جہاں انھوں نے آٹھ سال کی عمر میں قدم رکھا تھا۔

یہ ایک شہر تھا جہاں جب وہ بیمار پڑتا تو لوگ اس گیت کی پیروڈی کرتے ہوئے آتے جسے جلا ہوں نے اپنی ساڑیوں میں ایک بار بنا تھا۔ Shuye Thako Vidhyasagar Cheraryugi hoyey (ودیا ساگر ہمیشہ کے لیے بیمار پڑ جائے) یہ انتہائی تکلیف دہ صورت تھی۔

انھوں نے سنتھال پرگنہ میں کارمنتر کے مقام پر گھر بنایا تھا اور اکثر کلکتے سے نکل کر یہاں آجایا کرتے تھے۔ وہ زیادہ وقت قبائلی لوگوں کے ساتھ گزارا کرتے تھے۔ ان لوگوں کی پرخلوص سادہ لوحی اور معصومیت ان کے زخمی احساسات و جذبات پر مرہم کا کام کرتی تھی اب کارمنتر کے ریلوے اسٹیشن کو جوجمن تارا اور مادھوپور کے درمیان ہے، ودیا ساگر کا نام دیا گیا ہے۔

1871 میں بھاگوتی دیوی یہاں سے دور بنارس میں انتقال کرگئیں اور ودیا ساگر Havishyanna (ایسی نیم پخت غذا جو روایتی طور پر سوگ منانے کے دوران لی جاتی ہے) کھانا ایک سال تک کھاتے رہے۔ جب کبھی گفتگو کے دوران بھاگوتی کا تذکرہ آجاتا تو وہ بچوں کی طرح رو پڑتے تھے۔

ٹھاکرداس کا انتقال 1876 میں ہوگیا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ودیا ساگر نے جن کی عمر 56 برس تھی۔ اپنے والد سے کلکتے میں بادر باگان میں مکان بنانے کی اجازت مانگی تھی۔ کلکتہ میں شہر تھا جہاں دونوں باپ بیٹے نے مل کر زندگی کی جدوجہد شروع کی تھی۔ 1 جنوری 1880 کو حکومت نے انھیں پر وقار اعزاز C.I.E. عطا کیا۔ رسمی لباس میں گورنر کے دفتر جانے سے بچنے کی خاطر ودیا ساگر کارمنتر چلے گئے۔ بعد کو وہ تمغہ ان کے گھر پر ہی بھیج دیا گیا۔

1887 میں سرکار نے انھیں Mahopadhyayo کا اعزاز دینا چاہا لیکن انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ تقاریب میں شرکت کرنے کے قابل نہ ہونے کی معذرت خواہی اور طبی صداقت نامہ منسلک کرنا بڑا تکلیف دہ کام ہے 1888 میں ودیا ساگر کو ان کی 55 سالہ شریک حیات اور پانچ بچوں کی ماں دینا موئی کی رحلت کا صدمہ پہنچا۔ وہ ایک فراخ دل، کھلے ذہن کی عورت تھیں ساتھ میں ایک لائق خاتون خانہ تھیں جنھیں لوگوں کو اپنے ہاتھوں کا پکایا کھانا کھلانے میں خوشی ملتی تھی۔

ایک رات جب ودیا ساگر 32 سال کے نوجوان تھے۔ اور ایک بچے کے باپ تھے جس کی عمر 2 سال تھی، ڈاکوؤں نے ورسمہا میں ان کے گھر پر ڈاکا ڈالا۔ جیسے ہی ڈاکوؤں نے سامنے کا دروازہ توڑا خاندان کے کئی افراد پیچھے کے دروازے سے بھاگ نکلے۔ ودیا ساگر کو یہ بزدلی کا کام محسوس ہوا وہ چاہتے تھے کہ وہیں ٹھہریں اور ڈاکوؤں کا مقابلہ کریں ''میں بھی یہیں رکوں گی'' نارائن کو گود میں لیے دینا موئی نے کہا۔ ودیا ساگر کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا اور دوسروں کی طرح وہ بھی پچھلے دروازے سے نکل گئے۔

ایسے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ودیا ساگر نے 1870 میں نارائن کی ایک بیوہ سے شادی کو دینا موئی سے کیوں راز میں رکھا۔ اور اس وقت ہی بتایا جب شادی ہوگئی۔ نارئن سے ایشور چندر مایوس ہوگئے تھے اور 1874 میں ایک وصیت کے ذریعے نارئن کو اپنی جائداد سے محروم کردیا کیوں کہ وہ گمراہ اور بدکردار ہوگئے تھے۔ دینا موئی نے چوری سے اپنے بیٹے کی مدد کرنا چاہی مگر اپنے شوہر کی خلاف ورزی نہ کرسکیں۔

بیوی کی آخری بیماری کے دوران ودیا ساگر نے بڑی محنت سے ان کی تیمارداری کی، بیوی کی آخری خواہش تھی کہ ودیا ساگر اپنے بچے سے سمجھوتہ کرلیں۔ بیوی کی موت کے بعد ودیا ساگر نے ایک نئے انداز سے ان کی بات پر عمل کیا۔

1890 میں دینا موئی کی وفات کے 2 سال بعد اور اپنی موت سے ایک سال پہلے ودیا ساگر نے اپنی ماں کی یاد میں باوجود صحت کی خرابی کے ایک اسکول قائم کیا اور اسے اپنی بیوی کے نام موسوم کرتے ہوئے بھاگوتی ودیالیہ نام رکھا۔

ودیا ساگر نے آخری سانس کلکتے میں لی۔ ودیا ساگر آخر دم تک ہوش و حواس میں رہے اور انھوں نے 29 جولائی 1891 کو خوش دلی اور خوش مذاقی کے ساتھ اس دنیا کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہا۔ ان کی موت قوم کا زبردست نقصان تھی۔

آزادی کا جذبہ

ودیاساگر کبھی بھی براہ راست سیاست میں ملوث نہ تھے۔ جب پہلی جنگ آزادی 1857 میں لڑی گئی اس وقت ان کی عمر 37 برس کی تھی۔ اس زمانے میں ودیاساگر سرگرمی سے بیواؤں کی دوبارہ شادی کی تحریک میں مصروف تھے۔ اس کے باوجود اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ودیاساگر اس جنگ آزادی میں شریک ہوئے ہوں یا کوئی چیز ایسی لکھی ہو جو انگریزوں کو ناراض کرتی ہو۔

پھر بھی وہ ایک کٹر قوم پرست تھے۔ اس زمانے میں جب تعلیم یافتہ لوگ گاؤں کو چھوڑ کر شہروں میں منتقل ہو رہے تھے اور جب وہ لوگ اپنے کردار کو مسخ کرتے ہوئے مغرب کی نقالی میں یوروپین کپڑے پہنے اور انگریزی میں گفتگو کرنے لگے تھے ودیاساگر نے سنسکرت اور بنگالی کی ترویج میں زبردست رول ادا کیا اور مادری زبان میں تعلیم کو عام کیا۔ وہ ہمیشہ ہاتھ سے بنی ہوئی دھوتیاں پہنتے تھے اور ایک چادر لپیٹ لیا کرتے تھے۔ وہ چپل پہنتے تھے جن کی نوکیں اوپر کی طرف مڑی ہوتی تھیں اور وہ ان کی شخصیت کے ساتھ اس قدر جڑ گئیں تھیں کہ لوگ اسے ودیاساگری چوٹی کہا کرتے تھے۔ پست قد مگر بڑا سر، ودیاساگر ایک پرانے انداز کے انسان تھے۔ مہاتما گاندھی سے بہت پہلے ودیاساگر نے انگریزی تسلط کے خلاف احتجاجاً ایک ایسا لباس پہنا جس سے ہندوستانیت نمایاں ہوتی تھی اور گاؤں میں بسنے والے ہندوستانیوں کی پہچان ہوتی تھی۔

ایک بار کلکتے کی میوزیم میں داخل ہوتے وقت ان سے چپلیں اتارنے کے لیے کہا گیا اگرچہ ان کے ساتھ آنے والے دوسرے لوگوں کو نہیں روکا گیا کیوں کہ جوتے پہنے ہوئے تھے۔ انھوں نے واپس لوٹ جانا پسند کیا مگر اس امتیازی رویے کے سامنے جھکے نہیں۔

ایک اور موقعے پر جے کار، پرنسپل ہندو کالج (پریسڈنسی کالج) نے اپنے سامنے کی میز پر جوتے پہنے ہوئے پیر پھیلا کر ودیاساگر سے بات کی جب کار کی باری آئی اور وہ ایشور چندر سے بات کرنے گئے تو انھوں نے دیکھا کہ ایشور چندر بھی اسی طرح سامنے والی میز پر چپل پہنے پیر پھیلائے بات کر رہے تھے ایشور چندر نے کار سے کہا" میں نے سمجھا تھا کہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے انگریز اپنے مہمانوں کا استقبال کرتے ہیں۔

ایک اور واقعہ اسی طرح کا ہے ایک مرتبہ کسی بنکویٹ ہال (اعزازی دعوت کا کمرہ) کے دربان نے ایشور چندر کو اندر جانے سے روک دیا تھا کیوں کہ وہ وہاں اپنی دھوتی اور چادر میں گئے تھے۔ پھر ایشور چندر یوروپین لباس میں آئے تو دربان نے فوراً اندر جانے دیا۔ جب بنکویٹ (دعوت) شروع ہوئی (جو کہ خود ان کے اعزاز میں تھی) تو انھوں نے کھانے پینے کی چیزیں اپنے کوٹ کی جیبوں میں ٹھونسنا شروع کر دیا۔ اپنے آس پاس کے لوگوں کو جو پہلے ہی سے حیرت زدہ ہو کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے ان سے انھوں نے کہا کہ انھیں یہ سمجھایا گیا کہ یہ ڈنر ان کے لیے نہیں ہے بلکہ ان کے اس یوروپی لباس کے لیے ہے اس لیے وہ اس لباس کو کھلا رہے ہیں۔ ایک اور واقعہ فریڈرک ہالی ڈے سے متعلق ہے جو بنگال کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ وقتاً فوقتاً گورنر صاحب ایشور چندر کو مشورے کے لیے اپنے ہاں بلا لیا کرتے تھے۔ کچھ ملاقاتوں کے بعد ایشور چندر نے بے تکلف ہو کر گورنر سے کہا ہر بار رسمی لباس میں ہی آنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے اس لیے اگر انھیں اپنے روزمرہ کے لباس میں آنے کی اجازت نہ ملی تو شاید ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری رکھنا ان کے لیے ممکن نہ ہوگا یہ آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کا ایشور چندر کا طریقہ تھا اور وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد سے انھیں اپنے روزمرہ کے لباس میں ہی گورنر ہاؤس آنے جانے کی اجازت مل گئی۔ ان کا لباس اور ان کے طور طریقے انگریزوں کے خلاف محض احتجاج میں نہ تھے بلکہ عام طور پر ہر ناانصافی تسلط یا استبداد کے خلاف تھے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ایشور چندر سر راہ ایک معمولی اناج والے کی دوکان پر بیٹھے اس سے باتیں کر رہے تھے کہ پاتھک پارا کے شاہی خاندان کا ایک فرد ایک گلی میں پاس سے گزرا وہ رکا اور ایشور چندر سے گفتگو کی لیکن بعد کو ایشور چندر سے کہا کہ ایسا کرنے میں اسے بڑی بے عزتی سی محسوس ہوئی۔ اس پر ناراض ہو کر ایشور چندر نے فوراً جواب دیا" آپ اپنی عزت بچانے کی خاطر ایسا کر سکتے ہیں کہ میرے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھیں۔ یا اگر آپ کہیں تو میں آپ سے ملنا جلنا بھی چھوڑ دوں لیکن میں آپ کی عزت کی خاطر ان لوگوں سے جن کے ساتھ آپ نے مجھے دیکھا میں اپنا تعلق توڑ نہیں سکتا۔"

ایسا نہیں تھا کہ ایشور چندر کو نفیس اور آرائشی چیزیں پسند ہی نہیں تھیں۔ کلکتہ میں دادور بگان کے ان کے مکان میں قیمتی کتابوں کی ایک اچھی لائبریری تھی۔ بات

صرف اتنی تھی کہ انھوں نے اپنی ترجیحات مقرر کر رکھی تھیں۔ ایک بار کسی دوست نے ان سے دریافت کیا کہ وہ کتابوں کی جلد بندی وغیرہ پر اتنا خرچہ کیوں کرتے ہیں جب کہ غیر مجلد کتابوں سے بھی یکساں طریقے پر استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس دوست کی قیمتی شال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایشور چندر نے کہا کہ وہ ایسی قیمتی شالوں پر زیادہ روپے پیسے کیوں خرچ کرتے ہیں جب کہ معمولی سستی شال سے بھی یہی کام چل سکتا ہے۔

نمائش پسند لوگوں کے بارے میں بنگالی بابو ایشور چندر کا خیال تھا کہ ایسے لوگوں کو جھٹکا دینے والی باتوں سے سبق سکھانا چاہیے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ مدنا پور سے کچھ لوگ ایشور چندر سے ملنے ان کے گھر آئے۔ اس وقت ایشور چندر اپنے صحن کے باغیچے میں غیر ضروری گھاس وغیرہ صاف کر رہے تھے۔ ایسی حالت میں ان کے کپڑوں کو اور کام کو دیکھتے ہوئے ان لوگوں نے سمجھا کہ یہ کوئی مالی ہوگا انھوں نے تحکمانہ انداز میں ان سے پوچھا ''کیا ودیا ساگر مہاشے گھر پر ہیں؟'' انھیں جواب ملا کہ انھیں کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا کیونکہ ودیا ساگر کسی کام میں مصروف ہیں۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ان لوگوں نے مالی سے کہا کہ وہ ان کے لیے تمباکو اور حقے وغیرہ کا بندوبست کرے۔ مالی نے ایسا ہی کیا۔ تمباکو اور حقہ پینے کے بعد ان لوگوں نے پھر ودیا ساگر کے بارے میں پوچھا۔ اس وقت تک مالی نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا اس لیے ان لوگوں سے پوچھا'' آپ لوگوں کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔'' ان لوگوں نے پھر کہا ''بس ودیا ساگر کو بلا لاؤ'' جب مالی نے کہا کہ ''میں ہی ودیا ساگر ہوں'' تو وہ شرمندہ ہو گئے۔

ایک اور موقعے پر ایک بنگالی ڈاکٹر ریل سے اپنا بیگ لے کر اتر پڑے۔ انھوں نے آواز دی۔ ''قلی'' اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ڈاکٹر کا سامان بہت کم تھا مگر وہ بار بار قلی کو آواز دے رہا تھا۔ ایک ننگ دھڑنگ بوڑھا آدمی دھوتی پہنے آیا اور ڈاکٹر کے سامان کو اٹھا کر، اسٹیشن سے باہر لے آیا۔ ڈاکٹر نے اس آدمی کو پیسے دینے چاہے مگر کسی طرح بھی وہ اس آدمی کو راضی نہ کر سکا اور بعد میں اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسے معلوم ہوا کہ وہ شخص کوئی اور نہ تھا بلکہ خود ودیا ساگر تھے۔

انسان دوستی

ایشور چندر بہت غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جو بھی کام کرتے تھے اس کی تنخواہ کے علاوہ انھیں ان کی کتابوں سے بھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ اپنے لیے اور گاؤں میں اپنے گھر والوں کے لیے تھوڑی سی رقم بچا کر وہ ساری آمدنی خیراتی اور خیر کے کاموں میں صرف کر دیتے تھے۔ یہ حسن سلوک بھکاریوں اور معذورین کے لیے خیرات کی صورت میں نہیں ہوتا تھا بلکہ بیواؤں اور یتیموں، غریب و نادار طلبہ معذور اور وظیفہ خوار لوگوں کی امداد اور الاونس کی صورت میں ہوتا تھا اس کے علاوہ ایشور چندر ہر اس شخص کی بھی مدد کیا کرتے تھے جو ان سے مدد مانگا کرتا تھا۔

یہ سلوک اور یہ امداد اس صورت میں نہیں ہوتی تھی جیسا کہ مہاراجاؤں یا زمینداروں یا شہزادوں یا تجارت پیشہ لوگوں کی ہوا کرتی تھی۔ یہ اس شخص کے دل کے اندر کی خواہش تھی اور ایک اندرونی جذبہ تھا جو خود بھی بہت غریب رہا اور اس وقت تک بھی خوش حال نہ تھا۔ یہ جذبہ بھاگوتی دیوی کی دین تھا جو باوجود غربت کے پورے گاؤں کی مدد کرنے کی کوشش کرتی تھیں اور کوئی بھی بھکاری خواہ دن کو آئے یا رات میں اس کی بھی مدد کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔

ایشور چندر کسی کی مصیبت کے خیال سے بھی پریشان ہو جاتے تھے۔ 19ویں صدی کے مشہور شاعر مائیکل مدھوسودن جب سخت مالی مشکلات سے دوچار تھے تو ہندوستان سے سوائے ودیا ساگر کے کسی اور نے ان کی مدد نہیں کی، مدھوسودن نے شکر گزاری کے احساس کے ساتھ ودیا ساگر کو لکھا، مجھے امید ہے کہ میں ہندوستان لوٹ آنے کے لیے زندہ رہوں گا۔ اور وہاں آ کر میں اپنے ہم وطن بھائیوں سے کہوں گا کہ تم صرف ودیا ساگر نہیں ہو بلکہ رحم دلی کا ساگر بھی ہو۔'' رام کرشن پرم ہنس ایشور چندر کو محبت سے کھیر ساگر کے نام سے بھی یاد کرتے تھے یعنی دودھ کا سمندر انسانی ہمدردی کے [illegible] مہاتما گاندھی نے بھی لکھا ایشور چندر علم کا ہی سمندر نہیں تھے وہ محبت، ہمدردی کشادہ دلی کے ساتھ ساتھ بہت ساری خوبیوں اور قدروں کے سمندر تھے۔

تاہم اس سمندر کی تہہ میں ایک آگ بھی تھی جیسا کہ شاعر ستیندر ناتھ دت نے کہا

"Sagarey je agni thake kalpana she noy Tomay dekhe iagatbashir hoyechhe Prat Yoy" (تمھیں دیکھ کر دنیا کو یقین ہو چلا ہے کہ پانی کے اندر آگ محض ایک خیالی احساس نہیں)

❑❑❑

National Council for Promotion of Urdu Language * New Delhi *
ACC No. 51781
15/10/08

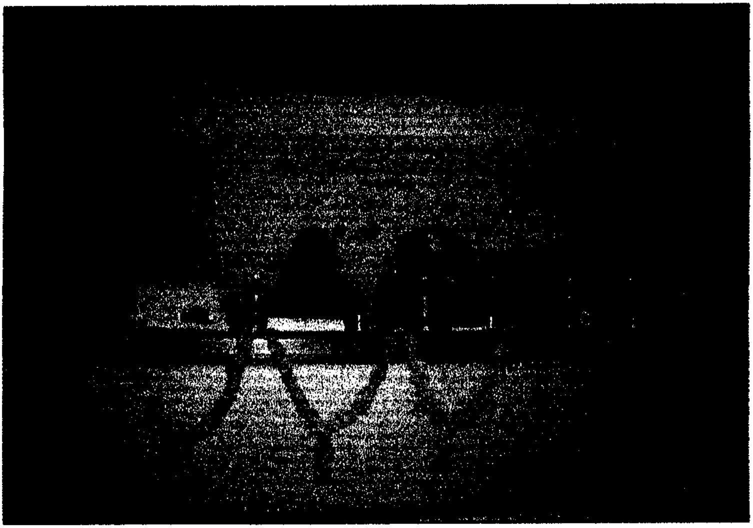

قومی اردو کونسل اور ہریانہ اردو اکادمی کے زیر اشتراک 24 اور 25 اکتوبر 2005 کو چنڈی گڑھ میں ایک مذاکرہ بعنوان ''بابا فرید کی شاعری، فلسفہ اور تعلیمات'' منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر تصویر میں (بائیں سے) جناب کشمیری لال ذاکر (سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی)، جناب آر ایس گجرال (فنانشیل کمشنر اور سکریٹری تعلیمات، ہریانہ)، محترمہ طلعہ پروین، ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی (گورنر ہریانہ)، جناب پھول چند ملانا (وزیر تعلیم ہریانہ) اور جناب انل کمار (کمشنر اعلیٰ تعلیمات، ہریانہ)۔

ممتاز شاعر جناب مخمور سعیدی کو گذشتہ دنوں یوواچیتنا سمیتی، گورکھپور کی طرف سے آٹھویں فراق سمان سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر لی گئی ایک یادگار تصویر۔

RNI NO. 70323/99
DL-15052/2003-5
URDU DUNIYA Monthly, December 2005, Vol. 7, Issue:12 Date of Publication:25/10/200
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi.

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

دیوان آبرو

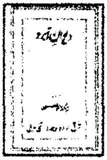

مرتب: ڈاکٹر محمد حسن

شاہ مبارک آبرو کا کلام شمالی ہند کی اردو شاعری کی اولین یادگاروں میں سے ہے اور اپنے دور کی عکاسی کے اعتبار سے صحیح معنوں میں گویا مرقع دہلی ہے اور جمالیاتی کیف سے بھی خالی نہیں ہے۔ یہ دیوان ڈاکٹر محمد حسن نے کلیات آبرو کے چھ دستیاب مخطوطوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے اور اس پر مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے۔ آخر میں فرہنگ بھی دی گئی ہے۔ جو طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 377، قیمت:-/25 روپے

دستنبو

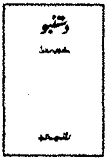

مصنف: مرزا غالب، مترجم: خواجہ احمد فاروقی

یہ مرزا غالب کی مشہور فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے جو خواجہ احمد فاروقی نے کیا ہے۔ کتاب ان واقعات کے دیدہ و شنیدہ احوال کے بیان پر مبنی ہے جو 1857 کی فوجی بغاوت کے دنوں میں دارالسلطنت دہلی میں رونما ہوئے۔

صفحات: 88، قیمت:-/12 روپے

تذکرہ گلشن ہند

مصنف: مرزا علی لطف

یہ شعرائے اردو کا مشہور تذکرہ ہے جو مرزا علی لطف نے جان گلکرسٹ کی فرمائش پر علی ابراہیم خاں کے فارسی تذکرے "گلزار ابراہیم" کو سامنے رکھ کر ضروری اضافوں کے ساتھ اردو میں مرتب کیا تھا۔ 1906 میں یہ تذکرہ علامہ شبلی نعمانی کی تصحیح اور مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔

صفحات: 308، قیمت:-/90 روپے

پنجاب میں اردو

مصنف: محمود خاں شیرانی

پروفیسر محمود خاں شیرانی کو اردو تحقیق کا معلم اول کہا جاتا ہے۔ "پنجاب میں اردو" ان کی مشہور ترین کتابوں میں سے ہے۔ اردو کے آغاز و ارتقا میں پنجاب اور اہل پنجاب کا جو حصہ ہے، اس کتاب میں پہلی بار اس کی نشاندہی کی گئی ہے اور تاریخی اور لسانی شواہد کی روشنی میں ان حقائق کو پیش کیا گیا ہے جو اس موضوع کو استحکام بخشتے ہیں۔

صفحات: 287، قیمت:-/110 روپے

سخن دان فارس

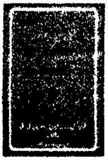

مصنف: محمد حسین آزاد

محمد حسین آزاد کو لسانی تاریخ سے خصوصی شغف تھا، یہ کتاب جو صرف فارسی زبان و ادب کی تاریخ ہی نہیں، ان تہذیبی، تمدنی اور نسلی رشتوں کا حوالہ بھی ہے جو اہل ہند اور اہل ایران کے درمیان زمانۂ قدیم سے موجود ہیں اور آج بھی جن کی تازگی پر کہنگی پوری طرح غالب نہیں آسکی ہے۔ آزاد کے مخصوص اسلوب تحریر نے تاریخی حقیقتوں کے بیان کو بھی افسانوی دلکشی بخش دی ہے۔

صفحات: 364، قیمت:-/134 روپے

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرہ کی زندگی، رسم و رواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت:-/216 روپے

افغانستان میں جدید دری (فارسی) شاعری

مصنف: ڈاکٹر غلام محمد لعل زاد

یہ کتاب ڈاکٹر غلام محمد لعل زاد کے فارسی تحقیقی مقالے پر مبنی ہے جسے ڈاکٹر شعیب اعظمی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے، اس کے مطالعے سے افغانستان کی جدید فارسی شاعری اور موجودہ دور کے اہم شاعروں سے واقفیت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کے طلبہ اور فارسی زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے شائقین کے لیے یہ کتاب ایک اہم تحفے سے کم نہیں۔

صفحات: 317، قیمت:-/80 روپے

پرواز

مصنف: ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام

ترجمہ اور تلخیص: گلزار (نقل حرفی۔ فرحانہ محمود)

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام کی خودنوشت سوانح عمری "پرواز" نہ صرف ڈاکٹر کلام کی نجی زندگی کی روداد ہے بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں آزاد ہندوستان کی تدریجی پیش رفت کی کہانی بھی بیان کرتی ہے۔ ان ولولہ انگیز واقعات و حقائق پر مشہور مصنف اور فلم ڈائرکٹر جناب گلزار نے یہ دلچسپ سی۔ ڈی۔ (آڈیو ورژن) تیار کی ہے۔

قیمت (کتاب مع سی۔ ڈی۔):-/175 روپے

نوٹ :- طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area
Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066.
Editor S. Mohan. Tel : 26103381, 26103938.